صوفی و مُلّا

اقبال کی فکر و نظر میں

خالد سردار

صوفی و مُلّا

اقبال کی فکر و نظر میں

خالد سردار

نگارشات

maablib.org

All rights reserved no part of this book may be reproduced in any form or by any means electronic or mechanical inculding photo copying recording or by any information storage retrieval system without prior permission of the publisher

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب: صوفی وملّا اقبال کی فکر ونظر میں

مصنف: خالد محمود

اسسٹنٹ پروفیسر اردو

دیال سنگھ کالج لاہور

ناشر: آصف جاوید 0321-9414442

برائے: نگارشات پبلشرز، 24۔مزنگ روڈ، لاہور

PH 0092-42-37322892 Fax 37354205

Facebook nigarshatpublishers-Email nigarshat@yahoo.com

مطبع: حاجی منیر پرنٹر، لاہور

سال اشاعت: 2018ء

قیمت: -/350روپے

انتساب

صوفی و مُلّا کے نام

''بیانُ المطلوب'' داتا گنج بخش کی تصنیف کے اردو ترجمہ ''کشف المحجوب''
سے دو اقتباس مترجم مولوی فیروز الدین:
''پس صفا کے معنی روشن اور ظاہر ہیں۔تصوف ان معنی کی حکایت ہے اور صوفی
لوگ اس مقام پر تین قسم کے ہوتے ہیں:

اول:صوفی

دوم:متصوف

سوم:مستصوف

صوفی: وہ ہے جو اپنے آپ سے فانی اور حق تعالیٰ کے ساتھ باقی ہو اور طبعی تقاضوں سے رہائی پا کر باطن کی حقیقت کے ساتھ ملا ہوا ہو۔

متصوف: وہ ہے جو مجاہدہ اور ریاضت سے اس درجہ (صوفی) کی تلاش میں منہمک ہو اور ہر معاملے میں صوفیا کرام کے طرز زندگی کو پیش نظر رکھتا ہو۔

مستصوف: وہ ہے جو مال و دولت اور جاہ و ثروت کی حفاظت کے لیے اپنے آپ کو صوفیا کی مانند بنائے رکھنے میں مصروف ہو اور ان دونوں مراتب کی اسے خبر نہ ہو۔''

’’علم ظاہر کے ایک جھوٹے مدعی نے کسی درویش سے پوچھا کہ ’’یہ نیلا لباس تونے کیوں پہنا؟‘‘ تو اس نے جواب دیا کہ ’’پیغمبرؑ اسلام سے تین چیزیں دنیا میں باقی رہی ہیں:

اول: فقر

دوم: علم

سوم: شمشیر

تلوار بادشاہوں کو ملی، جنھوں نے اسے موقعہ پر استعمال نہ کیا۔ علم علما نے اختیار کیا لیکن فقط اس کے سیکھنے پر اکتفا کیا اور اس پر عمل نہ کیا۔ فقر فقیروں کے گروہ نے اختیار کیا اور اس کو دولت جمع کرنے کا آلہ بنالیا۔ میں نے ان تینوں گروہوں کی مصیبت پر نیلا لباس پہن لیا۔‘‘

maablib.org

ترتیب

○ حرف بسم اللہ 9

1- زُہد اور رِندی 13

2- دل 15

3- تصویرِ درد 16

4- غزلیات 18

5- قطعہ 25

6- ظریفانہ 26

7- غزلیات 29

8- قطعہ 65

9- رباعیات 67

10- فرشتوں کا گیت 69

11- فرمانِ خدا 70

12- ذوق وشوق 72

13- جاوید کے نام 74

14- مُلّا اور بہشت 75

15- ساقی نامہ 77
16- پیرو مرید 80
17- تاتاری کا خواب 82
18- حال و مقام 84
19- پنجاب کے پیرزادوں سے 86
20- فقر 89
21- خانقاہ 91
22- شیخِ مکتب سے 92
23- باغی مرید 93
24- قطعہ 95
25- اجتہاد 96
26- مُلّائے حرم 98
27- توحید 99
28- جہاد 101
29- فقر و مُلوکیت 103
30- سلطانی 105
31- صوفی سے 106
32- تصوف 108
33- ہندی اسلام 110
34- شکست 112
35- مستیٔ کردار 114

36- مہدیٔ برحق 116
37- امامت 118
38- فقر وراہبی 120
39- غزل 122
40- نکتۂ توحید 123
41- اے پیرِ حرم 125
42- پنجابی مسلمان 126
43- آزادی 128
44- حکومت 130
45- تربیت 132
46- مرگِ خودی 134
47- مہمانِ عزیز 135
48- مدرسہ 136
49- اساتذہ 137
50- دین وتعلیم 139
51- جنوں 141
52- سرودِ حرام 142
53- مردِ بزرگ 144
54- رقص 145
55- نفسیاتِ غلامی 146
56- خواجگی 147

57- ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام 149
58- غلاموں کی نماز 151
59- محراب گل افغان کے افکار 153
60- ابلیس کی مجلسِ شوریٰ 160
61- زمین 167
62- آوازِ غیب 168
63- رباعیات 169
64- مُلّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض 170

maablib.org

حرف بسم اللہ

علامہ اقبال کی شاعری درحقیقت مسلمانوں سے خطاب اور ایک دردمند دل سے نکلی ہوئی گفتگو ہے۔ ایسے انسان کی جو مسلمانوں کو زوال میں دیکھ کر آزردہ ہوتا ہے۔ ایک حکیم کی طرح زوال کی وجوہات تلاش شروع کرتا ہے۔ اقبال یوں تو پوری دنیا سے مخاطب ہے مگر بالخصوص مسلمانوں سے اور پھر ہندوستان کے مسلمانوں سے۔

حجاز سے باہر مسلمانوں کے دو طبقہ ہائے فکر ہی مسلمانوں کی رہبری اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ ایک اہل علم، دوسرے اہل عرفان ان کو اور ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اہل علم کو اہل ظاہر، اہل شریعت اور اہل عرفان کو اہل باطن اور اہل طریقت۔ اہل علم کو مُلا اور اہل عرفان کو صوفی کے باوقار ناموں سے بھی پکارا جاتا ہے۔ دونوں اپنے اپنے طریق کے مطابق مسلمانوں کی تربیت کرتے رہے ہیں۔ ہندوستان میں صوفیا ہی کے ذریعے اسلام پھیلا اور لاکھوں ہندوؤں نے ان صوفیا کے ہاتھوں بیعت کر کے کلمہ حق پڑھا۔ اہل علم نے بھی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہونے والوں کو دِین کا علم سکھایا۔ اس طرح دونوں طبقہ ہائے فکر مسلمانوں کی رہبری و رہنمائی فرماتے رہے۔ چلتے چلتے یوں بھی ہوا کہ اہل علم اور اہل عرفان کی رقابت شروع ہوگئی اور یہ رقابت دوہرے تہرے رنگ میں ظاہر ہونے لگی۔ پھر صوفیا کی آپس میں، علما کی آپس میں۔ منصور حلاج جس نے اناالحق کا نعرہ بلند کیا حجاز سے باہر کے صوفیا میں سے تھا۔ ان کو ہمہ اوست والے بھی کہا جاتا ہے کہ سب میں خدا ہے۔ کچھ علما نے فتویٰ دیا کہ اس

نے کفر کیا ہے۔ قاضی القضاۃ نے سزائے موت دی۔ اس طرح اہل منبر، اہل علم اور فقیہہ ایک طرف تو دوسری طرف مجذوب، صوفی اور ملنگ نظر آتے ہیں۔ جنید بغدادی سے منصور کی سولی اور قاضی کے فتویٰ کے بارے میں پوچھا گیا تو اُنہوں نے کہا:

جس مقام پر سے منصور نے اناالحق کہا وہ سچا تھا۔

جس سطح سے مفتیوں نے فتویٰ دیا وہ بجانب حق تھے۔

مگر صوفی اور مُلا کی رقابت بڑھتی ہی گئی۔ ہندوستان کے اندر اورنگ زیب عالمگیر اور شہزادہ دارہ شکوہ کی جنگ دراصل ان دو طبقہ ہائے فکر ہی کی جنگ تھی۔ دارہ شکوہ حضرت میاں میر لاہوری سے انتہائی عقیدت رکھتا تھا اور علما اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ تھے۔

پھر عہد عالمگیر میں سرمد کی پھانسی بھی اہل تصوف کے برعکس اہل علم کے مستحکم و طاقتور ہونے کی علامت ہے۔ اہل علم حکمرانوں سے قریبی تعلقات میں نظر آتے ہیں تو اہل تصوف پیر نظام الدین اولیا سلطان سے ملنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ سلطان خود درگاہ میں آنے کی خواہش کرتا ہے تو نظام الدین فرماتے ہیں کہ میرے حجرے کے دو دروازے ہیں اگر بادشاہ ایک دروازے سے داخل ہوگا تو میں دوسرے دروازے سے باہر نکل جاؤں گا۔

دونوں طبقہ ہائے فکر روزانہ لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ آستانوں پر عقیدت مندوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ نظر آتے ہیں تو اہل علم بھی روزانہ لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی رہبری کرتے ہیں۔ زندگی کی ابتدا سے لے کر انتہا تک ہر ہر قدم پر عام مسلمان ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

اقبال نے ان ہی دو طبقوں کے عمل کو پیمانہ بنایا اور مسلمانوں کے زوال کی وجوہات ان دونوں طبقوں کے عمل میں نظر آئیں۔ جب عام مسلمانوں کے رہبر و رہنما ہی اپنے اعلیٰ اور برتر مقصد سے روگردانی کرنے لگے تو خود بھی زوال میں آئے اور ملت کی ملت کو زوال کے پاتال میں گرا دیا۔ حالانکہ اقبال بادشاہوں میں اورنگ زیب عالمگیر علما میں شاہ ولی اللہ اور صوفیا

میں محدث احمد دہلوی کو ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے محافظ سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلام ان تین ہستیوں کی جدوجہد سے موجود ہے۔ بہرحال اقبال نے مسلمانوں کے رہبروں صوفی وملا کے اندر در آنے والی کمزوریوں کو ہر رخ اور ہر رنگ سے دیکھا بھی ہے اور دکھایا بھی ہے۔

اقبال کو قومی شاعر قرار دینے کے بعد جو کچھ قوم اور قومی ورثے کے ساتھ کیا گیا وہی علامہ اقبال کے کلام کے ساتھ بھی ہوا۔ خودی، شاہین اور جھپٹنا پلٹنا پر سو سال گزار دیے اور جو کچھ اقبال نے کہا تھا اس کا زیادہ حصہ چُھپا دیا گیا۔ اقبال کے کلام کا مرکز میرے خیال میں مسلمانوں کا زوال ہے اور پھر اس زوال کی وجوہات کی تلاش ہے۔ مسلمانوں کے زوال کی بڑی وجہ صوفی وملا کا بذات خود زوال ہے۔ دوسری وجہ کالونیلزم، محکومی اور غلامی ہے۔ غلامی میں قوموں کا ضمیر بدل جاتا ہے۔ اقبال نے اس پر بھرپور گفتگو کی ہے اور غلامی کی کئی جہتوں کو واضح کیا ہے اور تیسری وجہ دولت کی ظالمانہ تقسیم ہے۔ مزدور اور کسان کی بدحالی اور سرمایہ دار اور جاگیردار کا ظالمانہ کردار ہے۔ ان ہی سے ملی ہوئی تقدیر اور مقدر کی مختلف تعبیریں ہیں۔

میں نے اقبال کے کلام میں صوفی اور مُلا کے بارے میں فرمودات اقبال کو ایک ترتیب دی ہے اور اس کے سادہ مطالب بیان کیے ہیں۔ ان کی لمبی مناظرانہ اور تاریخی تشریحات نہیں کیں۔ اقبال کے نکتہ چین دائیں اور بائیں والے اپنی پوزیشن بدل کر ادھر سے اُدھر ہو جائیں گے۔ میری دو اور کتب جو الگ چھپ چکی ہیں۔ ان تینوں کتابوں کو پڑھنے کے بعد اقبال کی فکر اور ہی رنگ میں نظر آئے گی۔

اقبال کے کلام کے مطالب بیان کرنے میں مولانا غلام رسول مہر کی کتاب مطالب کلام اقبال اردو سے مدد لی گئی ہیں۔ یوں تو کلام اقبال اردو پڑھنے والے کے ذہنوں پر نقش ہے۔ اور ہر کوئی اپنے مطلب کے اشعار نکال کر پڑھ دیتا ہے۔ ہوسکتا ہے میرا خیال خام ہو مگر میں یہ کہنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ مذکورہ بالا تینوں کتابوں کے پڑھنے کے بعد مسلمانوں

کے زوال کے اسباب اور اقبال کا نقطہ نظر مربوط انداز میں سامنے آئے گا۔ آج قریباً سو سال بعد اقبال ایک نئے رنگ میں سامنے آئیں گے۔

ہو سکتا ہے جامعات روایتی عنوانات سے نکل کر کلام اقبال کا جائزہ لینا شروع کر دیں! اب تک کلام اقبال سے روشناس کروانے کی بجائے شاہین کی خصوصیات موضوع بنا دی گئیں۔ اقبال کی زمینی جڑت توڑ کر خلا میں پہنچا دیا گیا۔ یہ تینوں کتابیں زمینی زندگی پر محیط ہیں ان میں زندگی کے حقائق اور معاملات پر اقبال کی فکر سے آگاہی ہوتی ہے!

خالد سردار (خالد محمود)
اسسٹنٹ پروفیسر اُردو
دیال سنگھ کالج، لاہور

maablib.org

زُہداور رِندی

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی
تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی
شہرہ تھا بہت آپ کی صوفی منشی کا
کرتے تھے ادب ان کا اعالی و ادانی
کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت
جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی
لبریز مئے زہد سے تھی دل کی صراحی
تھی تہ میں کہیں دُردِ خیالِ ھمہ دانی
کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی
منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی

اس نظم میں اقبال اپنا تعارف اسی مولوی کی زبان سے کرواتے ہیں۔ مولوی اقبال کی طبیعت کے تضادات سے پریشان ہے۔ اور کسی سے اقبال کے فلسفہ، تشعیہ اور حسن فروشوں سے میل ملاقات کا ذکر تعجب سے کرتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ میں تو خود اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہوں۔ اقبال کو اتنا پتہ ہے کہ میرے خیالات گہرے ہیں جن کا مولوی کو اندازہ نہیں ہو سکتا۔ مگر اقبال مولوی کا جو تعارف کرواتے ہیں وہ سماجی اور نفسیاتی حوالے سے بھرپور ہے کہ مولوی بہت مشہور ہے اور اس کے صوفی منش ہونے کا بڑا شہرہ ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو اپنے

دل میں زاہد مانتا اور اپنے آپ کو سب کچھ جاننے والا جانتا ہے۔ اور مولوی کی عادت ہے کہ اپنی کرامات کا ذکر بھی کرتا ہے جس کا مقصد مریدوں کی تعداد بڑھانا ہے۔

مریدوں کی تعداد بڑھانا اور اپنے ہمہ دان ہونے کا خیال اور اپنے زہد پر فخر اور لوگوں میں صوفی منش ہونے کا چرچا جس مولوی کی تصویر لاتا ہے۔ وہ اپنے مفادات کا اسیر ہے۔ یہ یاد رہے کہ بانگ درا کے 1905ء سے پہلے کے کلام میں یہ نظم ہے۔

دل

تو سمجھتا نہیں اے زاہدِ ناداں! اس کو
رشکِ صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانۂ دل

اس نظم کے پہلے شعر میں دار و رسن کو دل کی طفلانہ بازی اور التجائے ارنی کو فسانہ دل کی سرخی قرار دیتے ہیں۔ اور پھر کہتے ہیں کہ میرے کاشانہ دل پر کبھی عرش کا اور کبھی کعبہ کا دھوکا ہوتا ہے۔ پھر زاہد جس کو اپنے سجدوں پر ناز ہے۔ زاہد ناداں کہہ کر مخاطب کرتے ہیں کہ تجھ کو پتہ نہیں دل کی مستانہ وار لغزش پر سینکڑوں سجدے رشک کرتے ہیں۔ بہتر چیز اپنے سے بہترین چیز پر رشک کرتی ہے۔ جوں جوں کلام اقبال کا مطالعہ کرتے جائیں گے بات واضح ہوتی جائے گی کہ اقبال زاہد کو ناداں کیوں کہہ رہے ہیں۔ اقبال تو ایسے ایک سجدہ کا ذکر بھی کرتے ہیں جو ہزار سجدوں سے آدمی کو نجات دیتا ہے۔ اس شعر میں سجدے کا انکار نہیں بلکہ اس زاہد ناداں کو حقیقی سجود سے آگاہی دیتے ہیں۔

maablib.org

تصویرِ درد

زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے
غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے!
ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگیں بیانی کی
نصیحت بھی تری صورت ہے اک افسانہ خوانی کی
شجر ہے فرقہ آرائی' تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

اس نظم میں اقبال نے اپنے دل کے درد کو لفظوں میں ڈھال دیا ہے۔ کسی سماج یا قوم پر زوال آتا ہے تو عام لوگوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا اور خاص لوگ ایسی حالت میں بھی ذاتی مفاد کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔ اور ان کی فطرت میں کجی در آتی ہے۔ اقبال اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ اپنے فائدے کے لیے قرآن پاک کی سطروں کو صلیب کی نظر کر رہے ہو۔ قرآن میں اطاعت امیر کے لیے جو آیات ہیں کچھ مولوی حضرات نے انگریزوں کی حکمرانی کا مفہوم نکال لیا تھا۔ اقبال اس کو عقل کی کجی قرار دیتے ہیں۔ اور پھر منبر پر کھڑے ہو کر رنگین بیانی کی ہوس میں کہانیاں سنانے والے مولویوں اور واعظوں کا پردہ فاش کرتے ہیں۔ اس شعر میں رنگین بیانی افسانہ خوانی اور بالائے منبر اور پھر ہوس کا لفظ رکھ کر اقبال واعظوں کے ذہن و عمل سب سامنے لے آتے ہیں۔ کچھ بھی چھپا نہیں رہتا۔ منبر کو اپنی ذات اور شعلہ بیانی کی تشہیر کا ذریعہ بنانے والے مولویوں کی اقبال گرفت کرتے ہیں۔

تیسرے شعر میں اقبال تفرقہ بازی کے زہر کی لہر اور اس کے برے اثرات کا ذکر کرتے ہیں۔تفرقہ بازی قوموں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیتی ہے۔ایک کو دوسرے کا دشمن بنا دیتی ہے۔ ایک ہی جسم کے اعضا دوسرے اعضا کے خلاف صف آرا ہو جاتے ہیں۔ظاہر ہے تفرقہ بازی بھی علما اور مولوی ہی پھیلاتے ہیں۔اس طرح وہ اپنی الگ دکان چمکانے کے لیے دوسروں کو غلط اور بُرا کہتے ہیں اس طرح قومی وجود کے اندر تعصب کا زہر گھول دیتے ہیں۔اقبال اس کے برے اثرات سے باخبر کرتے ہیں! بالائے منبر رنگین بیانی کی ہوس میں ہوس کی تباہ کاریاں عیاں ہیں۔

maablib.org

غزلیات

عجب واعظ کی دین داری ہے یارب!
عداوت ہے اسے سارے جہاں سے
بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے!

پہلا شعر مطلع ہے اس میں اقبال واعظ کی جو صورت سامنے لاتے ہیں۔ وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ واعظ سمجھتا ہے کہ صرف وہی نیک ہے اور دوسرے تمام لوگ برے ہیں۔ اقبال تعجب سے اس کا اظہار خدائے بزرگ و برتر کی ذات سے کر رہے ہیں۔ اگر واعظ عام انسانوں کو حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھے گا تو کون اس کے قریب آئے گا۔ اس طرح دین اسلام جو سراسر مہر و محبت ہے کا یہ رخ عام مسلمانوں پر ظاہر نہ ہوگا۔

دوسرا شعر مقطع ہے اس میں اقبال واعظ کی عیاری اور مکاری کا پردہ چاک کرتے ہیں۔ پہلے مصرعے میں چالیں کا لفظ رکھ کر واعظ کے کردار کو بالکل عیاں کر دیا ہے۔ شطرنج میں ایک کھلاڑی دوسرے کو مات دینے کے لیے اپنی باری پر بادشاہ یا پیادے کو کسی خانے میں رکھتا ہے اس کو چال کہتے ہیں۔ اور اس کا مقصد حریف کو چکر دینا ہوتا ہے۔ اقبال واعظ کے اذان کی آواز پر لرز جانے کو واعظ کی چالیں قرار دیتے ہیں۔ اذان کی آواز پر واعظ کی لرزش کو اس کی اندرونی اور روحانی کیفیت کے برعکس ظاہری حرکت اور چالاکی قرار دیتے ہیں۔ اس طرح اقبال واعظ کی نفسیاتی طور پر اپنی پارسائی کے اظہار کی قلعی اتارتے ہیں۔

○

امیدِ حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

حضرت علیؓ کا فرمان ہے کہ میں خدا کی عبادت نہ جنت کے لالچ اور نہ ہی دوزخ کے خوف کی وجہ سے کرتا ہوں۔ بلکہ اس لیے کرتا ہوں کہ خدا کی ذات ہے ہی اس لائق کہ اس کی عبادت کی جائے۔ یہ بندگی کا بلند زینہ ہے۔ اقبال واعظ کا ذکر کرتے فرماتے ہیں کہ یہ حضرت دیکھنے میں بھولے بھالے سیدھے سادھے ہیں۔ اس مصرعے میں حضرت کا لفظ ہی سب کچھ واضح کر رہا ہے۔ حضرت کا لفظ کئی پرتیں سامنے لاتا ہے۔ بہرحال یہ حضرت جو بالکل سادے نظر آتے ہیں یہ سادگی بھی حضرت نے حوروں کے حصول کے لیے اپنا رکھی ہے۔ حضرت واعظ کی عبادات کا مقصد حوروں کا حصول ہے۔

○

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی' ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

پہلے شعر میں اقبال صوفیائے حق کے مرتبے اور کردار کا ذکر کرتے ہیں۔ کہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ جو دل کو گداز کر کے اس میں محبت پیدا کرتے ہیں اور یہ چیز بادشاہوں کے خزانوں میں نہیں مل سکتی۔ اور آئینۂ دل کو مصفا اور مجلّا یہ صوفیائے حق اور اہل فقر ہی کر سکتے ہیں۔

دوسرے شعر میں اقبال ان گدڑی پوشوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر تم ان کو دیکھو تو تمھیں پتہ چلے گا کہ یہ اپنی آستینوں میں ید بیضا لیے ہوئے ہیں۔ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا معجزہ تھا کہ ہاتھ کو آستین سے نکالتے تھے تو روشن ہوتا تھا۔ اقبال نبی کریمؐ کے امتیوں میں جو صوفیائے حق ہیں ان کا ذکر بڑے عقیدت اور محبت سے کرتے ہیں کہ ان میں کرامات کی حد نہیں۔

O

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

اقبال اس شعر میں زاہدوں سے اپنے آپ کو الگ الگ کرتے ہیں کہ زاہد کی عبادت اور نیکیوں کا مقصد ہی یہی ہے کہ جنت حاصل کی جائے۔ اس لیے یہ جنت زاہدوں کو دے دی جائے مگر میری بندگی جنت کے لالچ میں نہیں میں تو آپ کا دیدار چاہتا ہوں۔ میں تو آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تو آپ کی دید سے بازیاب ہونا چاہتا ہوں۔

O

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اَے واعظ!
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے
کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے
جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے
غرورِ زُہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو
کہ بندگانِ خدا پر زباں دراز کرے

پہلے شعر میں اقبال واعظ سے کہتے ہیں کہ تم نے خدا کو عرش پہ بٹھا رکھا ہے مراد اقبال کی یہ ہے کہ خدا کو انسانوں سے دور کر دیا ہے کیونکہ عرش تک بندوں کی پہنچ ناممکن ہے اور ویسے تو خدا تو بندے کی شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ خدا تو ہر ہر جگہ اور ہر مقام پر موجود ہے۔ اقبال دراصل واعظ کی اس چال کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ بندوں اور خدا کے درمیان واعظ اپنے آپ کو وسیلہ بنانا چاہتا ہے۔ اقبال خدا اور بندے کے درمیان واعظ کو دیوار نہیں بننے دیتے۔

دوسرے شعر میں بھی واعظ سے پوچھتے ہیں کہ اگر خدائے بے نیاز کسی بے عمل اور گناہ گار پر بارانِ رحمت برساتے ہیں تو تمھارا کیا بگڑتا ہے۔ واعظ چونکہ بے عمل یا کم پرہیز گار بندوں کو عذاب کا مستحق گردانتے ہیں اس لیے ہر ایسے بندے کو گرفتار عذاب دیکھنے کا شائق ہے اقبال واعظ کی اسی خواہش کی طرف اشارہ کرتے ہیں دوسرا پہلو یہ کہ خدائے بزرگ و برتر کی رحمت بے عملوں پر بھی ہو سکتی ہے۔

تیسرے شعر میں اقبال پھر واعظ کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں زہد کے غرور میں واعظ خدا کے بندوں پر زبان درازی کرتا ہے۔ اس شعر میں بندگان خدا اور زبان دراز واعظ، زہد اور غرور کے لفظوں میں بڑی شدت اقبال نے پیدا کر دی ہے۔ پہلے تو واعظ کی ذات کے اندر شدت ہے اپنے زہد کی اور پھر اس زہد کی شدت نے واعظ کے دماغ میں غرور پیدا کر دیا ہے۔ اس طرح واعظ اپنے آپ کو بلند اور برتر مقام پر فائز کر لیتا ہے اور عام لوگوں کو بندگان خدا کو حقیر جانتا ہے کم تر جانتا ہے اور ان پر زبان دراز کرتا ہے۔ بندگان خدا اور زبان دراز ان دونوں مرکبات کے اندر اقبال نے واعظ کی ذات کی شدت پیدا کر دی ہے کہ واعظ اپنے زہد کے غرور میں خدا کے بندوں کو کیا کیا کچھ کہہ جاتا ہے۔ زبان دراز کے لفظ میں اقبال نے بات واضح کر دی ہے کہ واعظ زہد کے غرور میں زبان درازی پر اتر آیا ہے۔

O

واعظ! کمالِ ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے
سوداگری نہیں، یہ عبادت خدا کی ہے!
اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے
واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبالؔ کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

اقبال پہلے شعر میں واعظ کو بتاتے ہیں کہ صرف ترک کرنے سے نہیں بلکہ کمال ترک سے مراد ملتی ہے۔ بڑا لطیف پہلو اقبال نے یہاں رکھ دیا ہے۔ ظاہری طور پر تو واعظ نے دین کے لیے دنیا کو ترک کیا ہوا ہے۔ اقبال اس لطیف فرق کو واضح کرتے ہیں کہ کمال ترک حاصل کرنا ہے تو جو دنیا چھوڑنے کے عوض عقبیٰ کے حصول کا لالچ ہے وہ بھی چھوڑنا ہوگا ترک کرنا ہوگا۔ عقبیٰ کے لالچ میں دنیا چھوڑنا بھی ایک لالچ کی وجہ سے ہوا۔

دوسرے شعر میں بھی اقبال اسی مضمون کو ایک اور رنگ سے بیان کرتے ہیں سوداگری کیا ہے۔ ہر ایک عمل کا حساب رکھنا اور پھر ہر عمل کے بدلے میں معاوضہ وصول کرنا اور معاوضہ بھی منافع کے ساتھ وصول کرنا سوداگری کا اصول ہے اور بندگی میں سوداگری نہیں چلتی۔ عبادت میں عبودیت میں بندگی میں جزا اور منافع کی تمنا اس کو سوداگری بنا دیتی ہے۔ اقبال یہاں اے بے خبر کہہ کر باور کرواتے ہیں کہ تو نے عبادت کو سوداگری بنا دیا ہے۔ جب تک تم جزا اور منافع کی خواہش نہیں چھوڑتے تب تک تم عبادت نہیں سوداگری کر رہے ہو۔ یہاں بے خبر کا کلمہ یہ وضاحت بھی کرتا ہے یہ دلالت بھی دیتا ہے کہ جس کو بے خبر کہا جا رہا ہے وہ بے خبر نہیں بلکہ کسی لالچ میں مبتلا ہے۔

تیسرے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ اگر واعظ مئے پینے کے لیے کسی نہ کسی طرح کسی نہ

کسی تاویل میں ثبوت لے آئے تو اقبال مئے پینا چھوڑ دے۔ اقبال واعظ کی ضد میں مئے پینا بھی چھوڑ دے۔ اقبال کو واعظ سے یہ ضد کیوں پیدا ہوئی۔ ضد لفظ سے یہ قرینہ بنتا ہے کہ واعظ نے اپنے آپ کو اتنا بے اعتبار کر دیا ہے کہ اب اس کی کسی بات کا اعتبار نہیں واعظ جو بات بھی کہے وہ اس کے سابقہ کردار گفتار کی وجہ سے قابل اعتبار نہیں اور تاریخی حوالے سے یہ بے اعتباری بلاوجہ نہیں۔

○

بھلا نبھے گی تری ہم سے کیوں کر اے واعظ!
کہ ہم تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں
الٰہی سحر ہے پیرانِ خرقہ پوش میں کیا!
کہ اک نظر سے جوانوں کو رام کرتے ہیں

پہلے شعر میں اقبال واعظ سے اپنے تضاد کو واضح کرتے ہیں۔ واعظ نفرت اور عداوت پیدا کرتے ہیں۔ ایک خاص معیار مقرر کر لیتے ہیں جو انسان اس معیار پر پورا نہیں اترتا اس کو بُرا سمجھ کر اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں مگر اقبال محبت کو عام کرنے والے ہیں اس لیے واعظ سے مخاطب ہیں کہ ہماری اور تمھاری نبھ نہیں سکے گی کیونکہ تمھارے اور ہمارے ذہنوں اور طبیعتوں اور رویوں میں تضاد ہے تیری اور میری فکر میں تضاد ہے۔ ہم محبت کرنے والے اور تم نفرت کرنے والے ہو۔

دوسرے شعر میں خرقہ پوش کا ذکر ہے۔ اس سے پہلے بھی اقبال نے خرقہ پوشوں کا ذکر کیا کہ آستینوں میں ید بیضا لیے پھرتے ہیں۔ اس شعر میں بھی اقبال خرقہ پوشوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے کمالات کہ ایک نظر میں یہ دلوں میں گھر کر لیتے ہیں۔ اقبال نے نظر کا لفظ کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ مکتب کی کرامت تھی کہ فیضان نظر تھا جس نے اسماعیل کو آداب فرزندی سکھا

دیئے۔اس شعر میں بھی خرقہ پوشوں کی نظر کا ذکر کرتے ہیں کہ ان کی نظر جادو کا کام کرتی ہے۔ سحر کیا ہے ظاہرا اسباب واضح نہ ہوں۔اگر ان دونوں شعروں کو ملا کر پڑھیں تو بات واضح ہوتی ہے واعظ تو ظاہری طور پر واعظ کا سہارہ لیتے ہیں مگر خرقہ پوش واعظ کے بغیر ہی جوانوں کو رام کر لیتے ہیں اس بنا پر لوگوں کے دلوں کو مصفا اور مجلآ کرنے کو سحر اور جادو کہا ہے۔

○

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برق طبعی نہ رہی، شعلہ مقالی نہ رہی

جواب شکوہ میں اقبال واعظ کے خیالات میں پختگی نہ ہونے کے شاکی ہیں کہ اس طرح اس کے وعظ میں ایمان کی روح نظر نہیں آتی۔کبھی تو اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ روح کو تڑپا دیتے تھے اور دلوں کو گرما دیتے تھے لیکن اب اس کے خیالات بلند اور اعلیٰ اور پختہ نہیں رہے۔اس لیے اثر بھی نہیں رکھتے۔

○

ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے؟

قبریں پتھروں سے بنتی ہیں پھر ان پر چڑھاوے چڑھتے ہیں اس طرح یہ پتھر کے صنم بکنے لگتے ہیں۔قبروں پر تجارت ہونے لگتی ہے! کیا نہ بیچو گے دراصل تم بیچ رہے ہو۔قبروں کو کمائی کا وسیلہ بنالیا ہے۔

maablib.org

قطعہ

کل ایک شوریدہ خواب گاہ نبیؑ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستاں کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں!
یہ زائرانِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں!
غضب ہیں یہ "مرشدان خود بیں" خدا تری قوم کو بچائے!
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں
سنے گا اقبالؔ کون ان کو، یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں!

خواب گاہ نبیؑ پر رونے والا شوریدہ اقبال ہی ہے۔ جو جانتا ہے کہ مصر اور ہندوستان میں مرشدان خود بیں امت مسلمہ کے اندر تو بگاڑ پیدا کر رہے ہیں اور ان کا اپنا قبلہ مغرب ہے اور رسول کریمؐ سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ اور ایسے رہبران قوم ہمارے رہنما نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ تو اپنے فائدے کے بندے ہیں۔ اپنی غرض کے غلام ہیں۔ یہ خدا اور رسول کی راہ پر نہیں ہیں بلکہ اپنی الگ راہ بنا رہے ہیں۔ مرشدان خود بیں سے مراد مذہبی رہنما اور سیاسی رہنما بھی مراد ہیں۔

ظریفانہ

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
''پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے''

اس دو شعروں میں اقبال نے دو باتیں کہی ہیں۔ آخری مصرعہ اکبرالہ آبادی کا ہے مطلب یہ کہ آج کل کے لڑکے لڑکیوں کی طرح بننے سنورنے لگے ہیں اور چال ڈھال اور گفتگو میں بھی لڑکیوں جیسی ادائیں دکھاتے ہیں۔ پہلے شعر میں شیخ صاحب کی حقیقت بتا دی کہ وہ پردے کے حامی نہیں۔ کالج کے لڑکے تو خواہ نخواہ شیخ صاحب سے بدظن ہو گئے ہیں۔ کالج کے لڑکے سمجھتے ہیں کہ شیخ صاحب پردے کے حامی ہیں۔ کل شیخ صاحب نے اپنے وعظ میں صاف صاف کہہ دیا کہ لڑکیوں کو پردے کی ضرورت نہیں کیونکہ آج کل کے لڑکے لڑکیوں ہی کی طرح کے ہیں۔ اصل بات کی طرف اقبال نے ظریفانہ رنگ میں بڑے لطیف انداز میں اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ شیخ صاحب تاویل کر کے مسئلے کو اپنی مرضی سے کوئی بھی رنگ دے لیتے ہیں۔ کبھی اپنی مرضی اور کبھی کسی کے مرضی سے تاویل کا ہتھیار استعمال کر کے صاف نکل جاتے ہیں۔

maablib.org

○

کچھ غم نہیں جو حضرت واعظ ہیں تنگدست
تہذیبِ نو کے سامنے سر اپنا خم کریں
ردِ جہاد میں تو بہت کچھ لکھا گیا
تردیدِ حج میں کوئی رسالہ رقم کریں

اقبال نے ان دو شعروں میں مذہب سیاست علم اور علم الکلام اور غیر ملکی حکمرانوں کے اثرات اور مذہبی رہنماؤں کی تادیلات مسائل کیا کیا معاملات ہیں جو موجود نہیں ہیں۔ انگریزوں کی حکمرانی نے مذہب اور سماج کو کئی حوالوں سے بدلنے کی کوشش کی اور انگریزوں کی خوش قسمی اور مسلمانوں کی بدبختی کہ مذہبی لوگوں ہی سے انھیں ایسے لوگ مل گئے جو انگریزوں کی منشا کا پرچار کرنے لگے۔ایسے واعظ جو یہ کہتے کہ اب زمانہ بدل گیا ہے اب جہاد کا زمانہ نہیں رہا بلکہ اب قلمی جہاد کا زمانہ ہے تہذیب نئی کروٹیں لے رہی ہے۔انسان مہذب ہورہا ہے اب انسان تلوار کے بجائے دلیل اور علم سے کام لے گا کیونکہ مہذب انسان کی یہی تلوار ہے۔اقبال کہتے ہیں اس طرح رد جہاد میں تو بہت کچھ لکھا گیا ہے۔اگر کوئی واعظ تنگدست ہے تو وہ تردید حج میں کوئی رسالہ رقم کردیں۔اس طرح ایک نیا موضوع بھی لوگوں کے ہاتھ آئے گا اور واعظ کی غربت بھی ختم ہو جائے گی کیونکہ انگریز اس طرح کے واعظوں کو کبھی چھپے اور کبھی سرعام امیر کردیتے ہیں۔اور بے شک کچھ لوگ حج پر جو روپیہ لگتا ہے اس کے کئی اور مصارف کے بارے لب کشائی کرتے رہتے ہیں۔اقبال کا اشارہ انھی واعظوں کی طرف ہے۔

○

ہاتھوں سے اپنے دامنِ دنیا نکل گیا
رخصت ہوا دلوں سے خیالِ معاد بھی
قانونِ وقف کے لیے لڑتے تھے شیخ جی
پوچھو تو وقف کے لیے ہے جائداد بھی!

یہ بات زبان زد عام ہے کہ جب ہلاکو نے بغداد فتح کیا اس وقت وہاں کے علما آپس میں مناظروں میں مصروف تھے اور موضوع مناظرہ یہ تھا کہ سوئی کی نوک پر کتنے فرشتے بیٹھ سکتے ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر اشعار کی تشریح لکھتے ہیں کہ وقف سے مراد وقف علی الاولاد ہے جس کے لیے مولانا شبلی نے خاص کوشش فرمائی تھی اور قائداعظم محمد علی جناح نے مسودہ قانون مرکزی کونسل میں پیش کیا تھا۔ اس قانون کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی اولاد متروکہ جائیداد سے اپنے حصے کے مطابق فائدہ اٹھاتی رہے مگر اسے بیع یا رہن نہ کر سکے۔

اقبال اس خاص معاملے میں کئی اور پہلو بھی بیان کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے دنیاوی جاہ وجلال اور مال ومنال چھن گیا ہے۔ اور دلوں سے آخرت کا خیال بھی نکل گیا ہے۔ اقبال مالی اور ذہنی طور پر مسلمانوں کے دیوالیہ ہو جانے کا ذکر کرتے ہیں۔ اور پھر بتاتے ہیں کہ جب دنیاوی اور ذہنی دیوالیہ ہوتے جا رہے ہیں اس وقت شیخ صاحب وقف کے مسئلے پر آپس میں بھی اور دوسروں سے بھی قانون بنانے والوں سے بھی لڑ رہے ہیں اور جس چیز کے لیے لڑ رہے ہیں وہ چیز ان سے چھن چکی ہے۔

غزلیات

○

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی!
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی؟

اقبال کا کمال یہ ہے کہ بعض اوقات سوال کرتے ہیں تو اس کا جواب بھی سوالیہ انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ جس طرح بعض اوقات جواب کے اندر سوال رکھ دیتے ہیں۔ اس شعر کے پہلے مصرعے میں امر واقعہ بیان کر دیتے ہیں۔ یہ ایک مورخ کا انداز ہے کہ وہ لوگ جو خود کو اللہ والے کہتے ہیں یا عام مسلمان ان کو اللہ والے سمجھتے ہیں۔ ان کے پاس علم اور دین کی جو دولت تھی وہ لٹ چکی ہے۔ ان بظاہر اللہ والوں سے چھن چکی ہے۔ یہ تہی دست ہو چکے ہیں ان کا دامن دین اور علم دونوں سے خالی ہو چکا ہے۔ پہلے مصرعے میں لٹ کا لفظ پڑھنے والے کا خیال لٹیرے کی طرف لے جاتا ہے اور شعر پڑھنے والا دین اور علم کی دولت کے لٹیرے کے متعلق تجسس کا شکار ہو جاتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں اقبال کافر ادا۔ غمزہ خوں ریز کی تراکیب رکھ کہ ساقی سے سوال پوچھتے ہیں۔ کافر ادا اور غمزہ دونوں دلوں کو پھیرنے والے ہیں اور شعری روایت میں یہ دونوں جن کے دل پھیرتے ہیں ان کو قرب کی دولت سے مالا مال نہیں کرتے۔ قرینہ یہ بنتا ہے کہ جس لالچ میں یہ اللہ والے دین اور علم لٹوا بیٹھے ہیں وہ بھی ان ظاہری اللہ والوں نہیں ملے گا۔

○

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!
شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی!

تحقیق کا مادہ حق ہے۔حق کی تلاش تگ ودوکھوج کے لیے تحقیق کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اقبال اس بات سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ حرکت اور تجسس اور عمل سے صوفی اور ملا تہی دست ہو چکے ہیں۔اور صوفی اور ملا نے جب سے تحقیق کو چھوڑ کر اپنے غلام بنانے شروع کیے ہیں۔ دنیاوی حکمرانوں کی طرح مذہبی حکمرانی قائم کر لی ہے۔آخری مصرعے میں صوفی ملا اور ان کے پیروکاروں کے لیے غلام کا لفظ رکھ کر ان کی دینی حکمرانی کا اظہار فرمایا ہے۔اقبال اس بات ہی کے شاکی تھے کہ مذہبی رہنماؤں نے آقا و غلام کی روایت قائم کر لی ہے۔سماجی طور پر ہمیں اپنے اردگرد ایسے کئی لوگ نظر آتے ہیں جن کے نام کسی صوفی یا کسی ملا کے نام کے حوالے سے غلام فلاں غلام فلاں نظر آتے ہیں۔غلام اللہ۔غلام رسول۔غلام نبی اور غلامی علی تو عام مسلمانوں کی عقیدت ان ہستیوں سے ظاہر ہوتی ہے مگر اقبال غلام ملا اور غلام صوفی سے پناہ مانگتے ہیں کیونکہ پہلے مصرعے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ لوگ تحقیق سے تہی دامن ہیں۔ یہ غلاموں جیسا مزاج رکھتے ہیں اور غلام تحقیق نہیں کر سکتے۔

○

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں
کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو!

بت کدہ ہندوستان میں اسلام صوفیا کی کوششوں اور کردار کی بلندی کے سبب پھیلا۔صوفیا کے اخلاق اور کردار کی وجہ سے ہزاروں لاکھوں کافروں نے اسلام قبول کیا اور یہ خانقاہیں

اسلام اور مسلمانوں کا مرکز اور محور بن گئیں۔روپیہ چلتے چلتے ہی کھوٹا ہوتا ہے۔اقبال نے بڑے درد مند دل سے کئی اور جگہ بھی اس طرف اشارے کیے ہیں۔وہی جو رہبر تھے رہنما تھے اُن کا علم اور دین اُن سے لٹ چکے ہیں۔اس شعر میں بھی صوفیا کے کدو کے خالی ہونے سے اقبال بری طرح رنجیدہ ہیں۔اب جب صوفیا کے پاس کچھ ہے ہی نہیں تو عشق الٰہی عشق رسول، عشق حق کی شراب کس طرح بلائیں گے۔پھر اقبال نے پہلے مصرعے میں لفظ سبو چہ رکھ کر اور موجود زمانے کا ذکر کر کے اور دوسرے مصرعے میں صوفیوں کے کدو کے شراب حق سے خالی ہونے کا اظہار کیا ہے۔پھر اس زمانے میں اپنے چھوٹے سے پیالے میں شراب حقیقت پلانے کا ذکر ہے۔اسے غنیمت سمجھو۔خانقاہوں کا حقیقتِ الٰہی سے خالی ہونے کا رونا رو رہے ہیں۔

○

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ! نہ تراشِ آزرانہ!

اس شعر میں اقبال مدرسہ والوں سے بھی آزردہ ہیں کہ مدرسہ والے مدرسوں میں بت تراش رہے ہیں۔بت اور بُت خانے انسان کو خدائے واحد کی عبادت سے ہٹا کر اپنی پرستش کرواتے ہیں۔اقبال مدرسہ والوں سے اس لیے اور زیادہ رنجیدہ ہیں کہ اہل مدرسہ بت بننے اور بنانے میں بھی طاق نہیں کہ ان کے بنائے بتوں میں نہ ایسی ادائیں ہیں کہ لوگ ان کو دیکھ کر کافر ہو جائیں۔اور نہ ان کی تراش میں آزر کی ہنر مندی نظر آتی ہے کہ ان کے ظاہری حسن کو دیکھ کر ہی مر مٹیں۔یہ کہ نہ ان کا ظاہر آراستہ ہے اور نہ باطن پیراستہ ہے۔مطلب یہ کہ مدرسہ والے پختہ ذہنوں والے متعلم نہیں پیدا کر رہے! بلکہ پجاری بنا رہے ہیں اور خود بت بن بیٹھے ہیں اور پوجے جانے پر مطمئن ہیں۔

○

ضمیرِ لالہ مئے لعل سے ہوا لبریز
اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز
بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی
کیا ہے اس نے فقیروں کو وارثِ پرویز

موسم گل جوبن پر آیا تو ضمیر لالہ مئے لعل سے چھلک پڑا، ایسے موسم میں صوفی نے پرہیز توڑ دی۔ پرہیز توڑ دی میں بڑی باریکی ہے، تہہ داری ہے، کسی ذہنی کیفیت کے تحت، کسی لالچ میں، کسی اعلیٰ عہدے کے لالچ میں صوفی لڑھک گیا اور پرہیز توڑ دی۔ جو کام اسلام میں منع تھے وہ کر دیئے۔

دوسرے شعر میں فقیروں کا ذکر ہے جو پرویز کے وارث ہوئے۔ عشق اقبال کے ہاں جاندار جذبہ ہے۔ غلط آہنگ ہو تو عاشق کہیں کا کہیں جا پڑتا ہے۔ ایک تو حق سے عشق ہے مگر عموماً انسان کچھ جائز و ناجائز مقاصد سے بھی عشق کرنے لگتا ہے۔ مال و دولت سے عشق میں انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ بظاہر اہل فقر عشق حقیقی میں مستغرق نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں یہ وارث پرویز ہوتے ہیں۔ دنیاوی مال و منال، عزت اقتدار اور بلند مسند کے لیے تگ و دو کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ اہل فقر حقیقت میں پرویزی ہیں۔ پہلے شعر میں صوفی نے پرہیز توڑ دی دوسرے شعر میں اہل فقر مال و دولت کے وارث بن گئے۔

○

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی، وہ نگہ کی تیغ بازی
کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے
کہ میرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!

پہلے شعر میں فقر و سلطنت میں یہ امتیاز تھا کہ فقرا کے تکیے بادشاہوں کے درباروں کی طرح کے نہ تھے اہل فقر کے پاس دین کی دولت تھی جو بھی آتا دین کی دولت سے مالا مال ہو کر واپس جاتا۔ مگر اب فقرا کے تکیے بھی سلطانوں کے درباروں کی طرح ہو گئے ہیں۔ سلطانوں کے درباروں اور فقرا کے ٹھکانوں میں جو بڑا روحانی فرق تھا وہ امتیاز مٹ چکا ہے۔ اب فقرا کے تکیوں میں بھی نگہ کی تیغ کے کشتہ نظر آتے ہیں جس طرح سلطانوں کی سلطنتوں میں سپاہ کی تیغ کے کشتہ نظر آتے ہیں۔

دوسرے شعر میں وہی مضمون جاری ہے مسلمان ایک تسبیح کے دانے تھے ایک ملت تھے چونکہ میرِ کارواں میں خوئے دلنوازی نہیں ہے۔ دلوں کو موہ لینے والی ادائیں اس میں نہیں ہیں۔ اس وجہ سے تسبیح سے دانے ٹوٹ کر گرنے لگے کارواں سے میرِ کارواں کی کج فہمی کے سبب لوگ الگ ہوتے گئے۔ اس کا اتنا شدید اثر ہوا کہ عام مسلمان حرم سے جبکہ حرم مسلمانوں کا مرکز ہے سے بھی بدگماں ہونے لگے ہیں۔ یہ جو ملت میں بگاڑ اور انتشار اور بدگمانیاں پیدا ہو رہی ہیں یہ سب میرِ کارواں کے سبب سے ہے۔ اہل فقر مسلمانوں کے رہنما تھے انھوں نے فقر کو سلطنت کی صورت بنالیا ہے۔

○

مجھ کو تو سکھا دی ہے، افرنگ نے زندیقی
اس دور کے مُلّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی!

چلو مان لیتے ہیں کہ میں یورپ گیا ہوں اور اہل یورپ کے علم اور اثر نے مجھے مذہب سے برگشتہ کر دیا ہے۔ مگر اس دور کے ملا تو یورپ بھی نہیں گئے اور وہ علوم و فنون بھی نہیں سیکھے۔ پھر مُلا کیوں مسلمانوں کے لیے باعث ننگ بن گئے ہیں۔

پہلے مصرعے کے الفاظ کی ترتیب یہ قرینہ بتاتی ہے کہ اقبال پر زندیقی کا الزام لگایا جارہا ہے۔ اور اس کا سبب اقبال کا یورپ کا قیام بتایا جاتا ہے۔ مگر دوسرے مصرعے میں الزام کے برعکس امر واقع ہے کہ ملا اسلام اور مسلمانوں کے لیے باعث ننگ بن گئے ہیں۔

○

احکام ترے حق ہیں، مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند!

زرتشت پارسیوں کے پیغمبر پر اتری کتاب ژند اور ژند کی تفسیر پاژند ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ قرآن پاک میں جو کچھ ہے وہ حق ہے جو کچھ اللہ نے اس میں فرمایا ہے برحق ہے۔ مگر اپنے مفسیر۔ قرآن کی تفاسیر لکھنے والے تاویل کے پھندے کو اتنا پھیلاتے ہیں کہ اس میں ژند کے مضامین داخل کر دیتے ہیں قرآن کریم جو مقدس کتابوں میں واحد کتاب ہے جس میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہوئی۔ اور خدا کے آخری رسولؐ پر اتری خدا کی آخری کتاب ہے۔ مفسران قرآن تاویل کا سہارا لے کر اس کے احکامات کو دوسری کتابوں میں ملا جلا دیتے ہیں۔ اقبال صوفی ملا واعظ کے ساتھ مفسروں کی تفسیروں کا ذکر کر کے عام مسلمانوں کو ہوشیار کرتے ہیں کہ ایسے مفسرین کی تفسیروں کو پڑھتے ہوئے اپنے ایمان کو تھامے رہو۔ کیونکہ یہ مفسر تو قرآنی احکام میں دوسری کتابیں مدغم کر دیتے ہیں!

o

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہء مسجد ہوں' نہ تہذیب کا فرزند!
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں' بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

ان دونوں شعروں میں ایک ہی مضمون ہے۔ پہلے شعر میں دوانتہاؤں کا ذکر ہے۔اقبال کے دور میں بھی اور سوسال بعد آج بھی یہ دونوں انتہا پسند اتنے ہی شدت پسند ہیں جتنے تب تھے۔ ملاؤں کا طبقہ ہرنئی ایجاداور فکراور فلسفے کومردود سمجھتا ہے۔ٹرین پر بیٹھنااور انگریزی پڑھنا کفر قرار دیا گیا۔اوراس کے مدمقابل طبقہ ہرنئی چیز کوتہذیب کے نام پر بغیر سوچے سمجھے خوش آمدید کہنےاور اپنانے کے لیے تیار کسی چیز یا نظریے یا فکر کا یورپی ہونا ہی اس کی قبولیت کی سند سمجھتا تھا۔ جب سماج کی چولیں ہل جاتی ہیں تو ایسے انتہا پسند طبقے وجود میں آ جاتے ہیں۔ اقبال ان دونوں طبقوں سے اپنے آپ کو الگ کرتے ہیں کہ نہ تو میں مسجد کا ملا ہوں اور نہ ہی نئی روشنی اور نئی تہذیب کی تیز چکا چوند سے متاثر ہوں بلکہ میں وہی بات کرتا ہوں جس کو حق سمجھتا ہوں۔ میں طبقات کا بندہ نہیں بلکہ حق کا پیروکار ہوں۔اسی وجہ سے اپنے بھی مجھ سے خفا ہیں اور بیگانے بھی ناخوش ہیں کیونکہ میں تو زہر کو شکر نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی شکر کو زہر قرار دیتا ہوں۔ان دونوں طبقوں کی افراط وتفریط سے حق شناس الگ رہتا ہوں۔آج سوسال بعد بھی میانہ رو انسانوں کا اس سماج میں رہنا بہت مشکل ہو چکا ہے۔آج کا سماج صدیوں پرانا سماج حریف اور حلیف کا سماج بن چکا ہے۔رسول اکرمؐ کے زمانے میں بھی حریف اور حلیف کا سماج تھا۔مگر فتح مکہ کے بعد آپؐ نے حریف اور حلیف کا فرق ختم کر دیا اور سماج کو اس سطح سے اوپر اٹھا کر سچ اور جھوٹ حق اور ناحق انصاف اور ظلم کی ترازو میں رکھ دیا۔اقبال یہی کہہ رہے ہیں کہ میں نہ حریف اور نہ حلیف ہوں بلکہ حق کا پرستار ہوں!

○

رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی
کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

منصور حلاج اہل منبر کے فتوی کے تحت مُثلہ کر دیا گیا۔ جسمانی اعضا کے قطع کرنے کو مثلہ کرنا کہتے ہیں۔ عام روایات میں ہے کہ جب منصور کے کسی عضو کو قطع کیا جاتا اور دریائے فرات میں پھینکا جاتا تو پانی کے اوپر لہو سے انا الحق لکھا جاتا۔ بہر حال ان سے قطع نظر مسلمانوں کے ان دو بڑے طبقہ ہائے فکر میں چپقلش ابتدا سے ہی ہے۔

اہل شریعت، اہل طریقت، اہل علم، اہل عرفان، اہل ظاہر، اہل باطن۔

اقبال کہتے ہیں کہ اس میں منبر والے غلط بینی سے کام لے رہے ہیں۔ حلاج کی موت کے بعد اہل منبر یعنی فتویٰ دینے والوں نے اہل عرفان کو اپنا رقیب سمجھ لیا ہے۔ اہل علم اور اہل عرفان کی ہندوستان میں شدت اورنگ زیب عالمگیر اور دارہ شکوہ کی جنگ میں نظر آتی ہے۔ جس میں جیت ہمیشہ کی طرح اہل علم ہی کی ہوئی اور دارا شکوہ کو شکست ہوئی اور قتل کر دیا گیا۔

اقبال حلاج کے واقعہ کے اثرات اور اہل منبر کی اجتہادی غلطی کا ذکر کرتے ہیں۔

○

یہی شیخ حرم ہے جو چُرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلق اویسؓ و چادر زہراؑ؟

اس شعر کی تشریح یا وضاحت کرتے دل لرزنے لگتا ہے۔ شیخ حرم سے مراد مذہبی رہنما مولوی ملا۔ واعظ شیخ سب ہیں اور ان کا کردار کیسی پستی میں گر چکا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری، حضرت اویس قرنی اور جگر گوشہ رسول حضرت فاطمہ الزھرا...

شیخ حرم کیا کر رہا ہے مسلمانو۔ اقبال کیا بتا رہا ہے۔

O

تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گذر، ایسے امام سے گذر!

امام سے مراد پیش نماز بھی ہے اور ایسا مذہبی رہنما بھی جس کی تقلید یا پیروی کی جا رہی ہو۔ اقبال کہتے ہیں کہ تیرے امام کو خود حضوری نہیں ہے تجھ کو وہ کب کنارے لگائے گا۔ ایسے امام ہی کی وجہ سے تیری نمازوں میں بھی سرور نہیں ہے۔ ایسی نماز اور ایسے امام سے گذر۔ اقبال یہاں بھی حق اور سچ تک پہنچنے کے لیے ایسے بے حضور امام سے الگ ہونے کا کہتے ہیں۔ ظاہر ہے اگر رہبر اور رہنما ہی سیدھے رستے پر نہ جا رہا ہو تو وہ مقلدوں کو کس طرح حق تک منزل تک پہنچائے گا۔ لہٰذا اقبال بے سرور نماز اور بے حضور امام سے بچنے کا کہتے ہیں۔ نماز سے بچنے کا نہیں! کیونکہ نماز تو حضور ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

O

امین راز ہے مردان حر کی درویشی
کہ جبرئیل سے ہے اس کو نسبت خویشی
کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے؟
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی!

جبریل کو اس لیے جبریل امین کہا گیا کہ وہ وحی الٰہی کو ٹھیک ٹھیک اور بے کم و کاست ایمان داری سے خدا کے رسولوں تک پہنچا دیتے تھے۔ مردان حُر کا خاصہ بھی یہی ہے کہ جن باتوں کو حق سمجھتے ہیں ان میں کمی بیشی روا نہیں رکھتے اس امانت داری کی وجہ سے مردان حُر اور جبریل امین سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔

دوسرے شعر پر نظر ڈالیں کتنے سفینے ڈبو چکی ۔فقیہ ۔صوفی ۔شاعر کی ناخوش اندیشی ۔ایک طرف بلندی ایسی ہے کہ مردان حُر کو نسبت خوشی ہے آسمان کے پاس ہے ۔اور دوسری طرف پستی اتنی ہے کہ زمیں سے بھی نیچے سمندروں میں غرق ہونے والی پستی اور غرق ہونے والے سفینوں کو ڈبونے والے کون ہیں ۔فقیہ ۔صوفی ۔شاعر ۔عمومی طور پر ان ہی تینوں طبقوں کے ہاتھ قوم کی باگ ڈور ہوتی ہے ۔یہی قوم کو بناتے اور بگاڑتے ہیں ۔دنیا کی ہوس ۔روپے کے لالچ ۔عہدوں کی حرص ۔حکمرانوں کی کاسہ لیسی ۔غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط ثابت کرنا ۔قرآن کو تاویل سے پازند کرنا ۔ان ہی طبقوں فقیہ ۔صوفی ۔شاعر کا کام ہے اور یہ صدیوں سے ان گنت سفینے ڈبو چکے ہیں ۔اقبال ان سے بچنے اور ہوشیار رہنے کا کہہ رہے ہیں ۔

O

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا' نہ تن!

پہلے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ من کی دنیا میں ڈوب کر زندگی کا سراغ پا جا ۔من کی دنیا سوز و مستی سے لبریز ہے ۔من کی دنیا جذب و شوق سے پُر ۔اور من کی دنیا ہاتھ آ جائے تو پھر جاتی نہیں تن کی دنیا دولت کی طرح ہے اور دولت سائے کی طرح آتی جاتی رہتی ہے پھر اقبال اس پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ من کی دنیا میں افرنگی کا راج نہیں ہے ۔اور من کی دنیا میں شیخ اور برہمن بھی مجھے نظر نہیں آئے ۔جس طرح افرنگی کا راج غارت گری کر رہا ہے اسی طرح شیخ و برہمن بھی بربادی کر رہے ہیں ۔مگر ایسے لوگ جن کے دل سوز و مستی اور جذب و شوق سے لبریز ہیں ۔

اُن میں فرنگی اور شیخ و برہمن کا گذر اور غارت گری ناممکن ہے ۔ جب آدمی کسی کے

سامنے جھکتا ہے تو صرف جسم ہی نہیں بلکہ اس کی روح بھی جھک رہی ہوتی ہے اور یہ بات قلندر نے کہی تھی اور اقبال قلندر کورا کب کہتے ہیں مرکب نہیں۔

○

شکایت ہے مجھے یارب! خداوندان مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا!
قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

یارب! مکتبوں کے ناخداوں سے مجھے شکایت ہے کہ شاہین بچوں کو خاکبازی کی تعلیم دے رہے ہیں۔ شاہین کی بلند پروازی بلند نگاہی۔ استغنا جیسی صفات رکھنے والی قوم کے بچوں کو اہل مکتب کم ہمتی پستی اور خاکبازی کی تعلیم دے رہے ہیں۔ آج سو سال بعد بھی ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان کے کسی بھی مکتب سے ایسی بلند کردار کھیپ نہیں نکلی جن کی بلند کرداری بلند نگاہی کا بطور مثال حوالہ دیا جا سکے۔ سرکاری وغیر سرکاری مکتبوں چاہے وہ مذہبی ہوں یا دوسرے۔ کسی حد تک علی گڑھ والوں ہی کا حوالہ بنا۔ مگر وہ بھی تابع فرمان بیوروکریٹ ہی بنے قصہ کوتاہ ہماری تاریخ اقبال سے لے کر آج تک کوئی ادارہ بلند کردار کھیپ تیار کر کے مسلمانوں میں نہیں بھیج سکا۔ یہی شکایت اقبال کو مکتب والوں سے تھی اور آج پتہ چلتا ہے کہ اقبال ٹھیک شکایت کر رہے تھے۔

دوسرے شعر میں اقبال فقیہ شہر اور قلندر کا ذکر کرتے ہیں لمبی بحثوں کو چھوڑو۔ قلندر تو دو لفظ لا۔ الا کے سوا کچھ نہیں رکھتا۔ خدائے واحد کا اقرار اور جھوٹے خداؤں کا انکار بس دو ہی لفظ اس کے برعکس فقیہ شہر کے لیے۔ کیونکر۔ کیونکہ۔ لیکن مگر۔ اگر کا سہارا ایسا ہے کہ وہ اپنے آپ کو حق پر ثابت کرنے کے لیے لغت کا سہارا لیتا ہے اس طرح وہ لفاظی کر کے حق کو موڑ لیتا ہے اس میں اقبال فقیہ شہر کے بھی شاکی ہیں اور قلندر کے کردار کے معترف ہیں۔ ایک سجدہ اور ایک اقرار کرتا ہے۔ ہزار سجدوں سے انکار کرتا ہے!

o

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم!
دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟
اے مسلماں! اپنے دل سے پوچھ، ملا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم؟

جو خدا حقیقی کو حقیقی رازق سمجھتا ہے واللہ خیر الرازقین پر جس کا ایمان ہے دارا اور جم اس کے در کے گداگر ہیں مگر جو خدا کو رازق نہیں جانتے وہ بادشاہوں کے در پر گدائی کرتے ہیں۔ دوسرے شعر میں وہی مضمون جاری ہے۔ ایسے لوگ جو خدا کا در چھوڑ کر بادشاہوں کے در پر رزق کی بھیک مانگتے ہیں شکم کا سامان مانگتے ہیں شکم سے مراد تمام دنیاوی مال و دولت ہے اُن کے دل اور ضمیر مردہ ہو چکے ہیں۔ اب فیصلہ ہر مسلمان خود کر سکتا ہے کہ وہ دل کی ضمیر کی خودی کی موت کا خواہاں یا غیرت سے ہمیت سے انسانیت سے زندگی گذارنا چاہتا ہے اور یہ بات خود اپنے دل ضمیر سے پوچھ کہ حرم اللہ کے بندوں سے کیوں خالی ہو گیا ہے۔ ملا سے تو پوچھے گا تو وہ کئی تاویلات کر کے اصل سوال اور جواب گول کر جائے گا اور ہر بات کو موڑ کر کہیں اور لے جائے گا۔ کیونکہ حرم اِن ملاؤں کی شکم پروری ہی کی وجہ سے خالی ہوا ہے۔ ان نے حکمرانوں کو شکم پرور مان لیا تھا۔ جب یہ ملا ہی شکم کے بندے بن گئے تو ان کے دل پر موت چھا گئی اور حرم دل کی آزادی والوں سے خالی ہو گیا۔ با کردار اور اہل حق کے بجائے شکم پروروں نے حرم پر قبضہ جما لیا ہے! اب مسلمان ان شکم پروا ملاؤں سے ہوشیار ہو جائیں۔ حالات و واقعات کا تجزیہ کر کے اپنے دل سے فیصلہ کریں!

○

دل سوز سے خالی ہے، نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے
وہ آنکھ کہ ہے سرمہ افرنگ سے روشن
پرکار و سخن ساز ہے! نمناک نہیں ہے
کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سر دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے!

سوز سے خالی دل ہو تو نگاہ پاک نہیں رہتی ایسا انسان نہ سچ کا طرف دار ہوتا ہے اور نہ جھوٹ کے خلاف بے باکانہ کھڑا ہوتا ہے۔ ایسی آنکھ جو فرنگستان کے سرمے سے روشن ہو وہ ہوشیار مکار اور دغاباز تو ہو سکتی ہے مگر غمناک نہ ہو گی غمناکی دل کے سوز سے آتی ہے۔ دل کا آئینہ شکستہ ہو تو عزیز ترین ہو جاتا ہے۔ دل کی شکستگی اور سوز و گداز ہی سے آنکھ نمناک ہوتی ہے۔ صوفی ملا بیچارے کو میرے جنوں کی خبر کس طرح ہو سکتی ہے کہ نہ ان کے دل میں سوز و گداز ہے۔ نہ ان کا آئینہ دل شکستہ ہوا ہے۔ یہ تو ابھی ساحل پر کھڑے ہیں۔ بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق اور عقل لب بام تماشائی بن کر کھڑی تھی۔ صوفی اور ملا بھی میرے شوق میرے ذوق اور میرے جنوں کا کس طرح اندازہ کر سکتے ہیں۔ ان کے دامن کا کنارہ بھی ابھی چاک نہیں ہوا۔ دل کا چاک تو بڑی دور کی منزل ہے۔ ان اشعار میں اقبال صوفی اور ملا کو اس مقام سے عاجز قرار دیتے ہیں جس پیڈسٹل سے اقبال محو کلام ہیں۔ ان اشعار میں سرمہ۔ پرکار۔ سخن ساز۔ نمناک۔ آنکھ۔ جنوں۔ چاک تمام کی تمام شعری علامتوں کو اقبال نے کہیں کا کہیں پہنچا دیا ہے۔

O

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق!
مریدِ سادہ تو رو رو کے ہو گیا تائب
خدا کرے کہ ملے شیخ کو بھی یہ توفیق!
مرے لیے تو ہے اقرار باللساں بھی بہت
ہزار شکر کہ ملا ہیں صاحبِ تصدیق!

ہزار خوف ہو قلندر دل کی بات کو زبان پر لے آتا ہے۔ اور ایسے خوف کے ماحول میں بہت سے لوگوں کی زبانیں اور دل الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ حضرت حُر ہزار خوف کے باوجود دل کی بات زبان پر لے آئے۔ اور ہزاروں کوفیوں کے دل حضرت حسین کے ساتھ اور تلواریں یزید کے ساتھ۔ قلندر باطن اور ظاہر میں ایک ہی ہوتا ہے۔ جب شیخ نے پیر نے مرید کو گناہوں سے توبہ کی تلقین کی تو سادہ مرید (یہاں مرید سادہ اور شیخ۔ کا قرینہ۔ مرید سادہ کے متضاد بنتا ہے) نے تو رو رو کر خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور آئندہ گناہوں سے تائب ہو گیا۔ اللہ کرے کہ شیخ... کو بھی یہ توفیق ملے کہ وہ بھی گناہوں سے توبہ کرے۔

تیسرے شعر میں اقبال اپنے آپ کو زبان سے اقرار کرنے والا مسلمان قرار دیتے ہیں۔ اور ملا کو صاحب تصدیق کہتے ہیں۔ اور اس کے لیے ہزار شکر کرتے ہیں۔ ویسے تو صاحب تصدیق۔ اقرار بالسان کے مقابل آیا ہے مگر اقبال نے اس قرینے سے شعر میں استعمال کیا ہے کہ ملا سے اپنے آپ کو الگ کیا ہے اور اس کے لیے خدا کا شکر بھی ادا کیا ہے۔

○

سکھا دیے ہیں اسے شیوہ ہائے خانقہی
فقیہہ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب
وہ سجدہ' روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب!

یہ اقبال ہی کا جگر ہے کہ اُن نے مسلمانوں کے دینی رہبروں رہنماؤں کی گرفت کی۔ جس حقیقت کا ذکر اقبال کر رہے ہیں اقبال کے دور میں کس درجہ پر تھی وہ شعروں کے لفظوں میں روشن ہے۔صوفی نے اہل طریقت نے صوفیا کے طبقے نے شہر کے فقیہ کو اہل علم کو فقہ کے محافظ کو خراب کر دیا ہے۔اقبال مسلمانوں کی تاریخ کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد موجود بیماریوں کا ذکر کرتے ہیں۔ پہلے تو اہل طریق۔صوفیا کا طبقہ خراب ہوا اُن نے بھی طرز سلطانی اپنا لیے بلکہ سلطانوں سے بھی بڑھ گئے۔کہ سلطان تو صرف جسموں پر حکم چلاتے تھے۔ صوفیا نے اجسام کے ساتھ اذہان پر سوچ پر، فکر پر، عقل پر بھی قابو پا لیا غرض بدن اور روح دونوں کو غلام کر لیا۔ایک وقت میں کہ صوفیا کی آپس میں چپقلش اور صوفیا کی حکمرانوں سے چپقلش ہونے لگی۔اقبال کہتے ہیں کہ ان اہل طریقت نے سلطانوں جیسے اطوار اپنا کر پہلے خود کو خراب کیا اور پھر ان اہل شریعت سے میل جول نے یا پھر ان کی دیکھا دیکھی اہل علم یعنی اہل شریعت نے بھی وہی سلطانی طور اطوار اپنا لیے ان دونوں صوفیوں اور فقیہوں کی خرابی سے سچے سجدے کرنے والے جن کے دلوں کی گداختگی اور روح کے سرور وشوق سے زمین کی روح کانپنے لگتی تھی منبر و محراب ایسے سجدوں کو ترس رہے ہیں۔صوفی اور فقیہ کی خرابی سے منبر و محراب حقیقی سجدوں کو ترس گئے ہیں! پہلے شعر میں خاص بات یہ ہے کہ صوفی نے اہل باطن نے فقیہہ شہر اہل ظاہر کو خراب کر دیا ہے۔

O

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری!

سلطان اپنی سلطنت میں لوگوں کی جان و مال وعزت کا محافظ ہوتا ہے اور درویش لوگوں کو خدا کا رستہ دکھاتے ہیں اور لوگوں کی روح کو تر و تازہ اور مصفا کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ایک بدن کا محافظ اور دوسرا روح کا ایمان کا محافظ ہے۔اقبال دونوں سے نا امید ہیں۔سلطان بھی اپنے فرائض بھلا کر مسلمانوں کی جان و مال وعزت کی حفاظت نہیں کر رہے۔اور درویشوں نے بھی اپنے تکیوں سے مسلمانوں کی روحانی پیاس بجھانے کے بجائے اپنے نفس کی سیرابی شروع کر رکھی ہے۔اب سادہ دل بندے کدھر جائیں۔سلطان بھی عیار ہیں اور درویش بھی عیار ہیں۔ہم تاریخی حوالوں سے گریز کرتے ہیں چونکہ وہ سب تاریخ کے طالب علموں کے سامنے ہیں۔اقبال دکھے دل کے ساتھ نا امیدی کے ساتھ پریشانی کے ساتھ کہتے ہیں تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟ درویش بھی عیار، سلطان بھی عیار ہیں۔

O

کمال ترک نہیں آب و گِل سے مہجوری
کمال ترک ہے تسخیر خاکی و نوری!
میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا
تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری
حکیم و عارف و صوفی تمام مست ظہور
کسے خبر کہ تجلی ہے عین مستوری!

اہل تصوف اپنے پیرومرشد کے سامنے حلقہ بنا کر اذکار کرتے اور پیرومرشد سے فیض حاصل کرتے ہیں۔اقبال نے اس لیے اہل حلقہ کہا ہے۔ یہ آب وگل سے دوری سے مراد دنیا سے الگ تھلگ ہو کر اللہ اللہ کرنا اس کو ہندوستان میں صوفیا بڑا کمال جانتے تھے کہ فلاں نے دنیا ترک کر دی۔اقبال اس سے بہت نالاں تھے اور تاریخ سے آگاہ لوگ جانتے ہیں کہ کس طرح اس سوچ نے مسلمانوں کو دنیا سے دور بھی کیا اور دنیا کا غلام بھی بنا دیا۔اقبال اس کو کوئی بڑی بات نہیں سمجھتے بلکہ اقبال تسخیر خاکی ونوری زمین وآسمان پر چھا جانے، کائنات کو تسخیر کرنے، ایام کا راکب بننے کو کمال جانتے ہیں۔دنیا سے الگ تھلگ ہو جانے کو کمال نہیں جانتے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں اقبال اُن دو چار لوگوں میں ہیں جنھوں نے ترک دنیا کے خلاف آواز اٹھائی۔ترک دنیا ہندومت کے سنیاس کے ذریعے مسلمانوں میں در آیا۔ایک ہندو سن یاس میں دنیاوی دھندوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا۔اور یہ ہندوں میں بھی ان کے دور زوال میں آیا۔اقبال اس تاریخ سے پوری طرح آگاہ تھے اس لیے اس کو کمال نہیں جانتے۔

اے اہل تصوف اے اہل حلقہ میں تمھارے فقر سے دور ہوتا ہوں۔کیونکہ تمھارے فقر میں بے دولتی اور رنجوری ہے کہ تم دولت کے لیے دوسروں کے محتاج ہو۔اور ایک بیماری کی کیفیت تم پر طاری ہے۔سلطانوں نے اہل تصوف کے لیے کئی کئی قطعہ اراضی مختص کیے ہوئے تھے۔اس طرح یہ آمدن اہل تصوف کو ملتی تھی۔ایک طرف تو دنیا سے علیحد گی اور پھر اسی دنیا سے دولت لینا۔اقبال اس تضاد اور بیماری سے پوری طرح آگاہ تھے۔اور اہل حلقہ کے تصوف سے پناہ مانگتے ہیں۔یہ کیسا تصوف ہے جو اپنی ضرورتوں کے لیے سلطانوں کا محتاج ہے۔

تیسرے شعر میں حکیم، عارف اور صوفی اور تمام جوان سے ملتے جلتے ہیں تمام کے تمام مست ظہور ہیں۔ یہاں مولانا مہر لکھتے ہیں کہ تمام اہل فلسفہ اہل معرفت اور اہل تصوف اس کوشش میں ہیں کہ ذات پاک کا جلوہ انھیں نظر آئے۔لیکن ان میں سے کسی کو خبر نہیں ہے کہ جسے وہ تجلی سمجھتے ہیں وہ تو بجائے خود مستوری ہے مراد یہ کہ ذات پاک کو کوئی بے حجاب نہیں دیکھ سکتا جسے جلوہ سمجھا جاتا ہے وہ بھی ایک طرح کا پردہ ہی ہے اور اقبال ایک جگہ:

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

بہرحال اقبال یہاں بھی حکیم۔ عارف اور صوفی کے فہم کی کوتاہی کا ذکر کر رہے ہیں کہ وہ جلوہ۔ مستور اور ظہور کی حقیقت سے پوری طرح آگاہ نہیں ہیں!

O

نہ دیا نشانِ منزل مجھے اے حکیم تو نے
مجھے کیا گلہ ہو تجھ سے، تو نہ رہ نشیں نہ راہی!
یہ معاملے ہیں نازک، جو تری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی!

پہلے شعر میں تخاطب فلسفی سے ہے اقبال فلسفیوں سے نالاں ہیں کہ وہ حق تک پہنچنے کے متمنی ہیں مگر وہ حق تک پہنچنے کی راہ کے راہی نہیں۔ اکبرالہ آبادی نے

فلسفی کو بحث اندر خدا ملتا نہیں
ڈور سلجھا رہا ہے سرا ملتا نہیں

صرف بحث ومباحثہ کے عادی ہیں۔

دوسرے شعر میں خانقاہی نظام سے ناخوشی کا اظہار کرتے ہیں اور پھر یہ کہہ کر کہ یہ نازک معاملات ہیں۔ جو تمھاری مرضی وہ کرو۔ مگر مجھے تو یہ خانقاہی طریق اچھا نہیں لگتا۔ اس لیے کہ فقیہ شعر کو بھی صوفی نے خراب کر دیا ہے۔ خانقاہی نظام کے اثرات نے مسلمانوں کو کوشش اور جدوجہد سے دور کر کے بے عمل بنا دیا ہے۔ اسی لیے اقبال اس نظام کے نکتہ چین ہیں۔

○

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ!
حدیث دل کسی درویش بے گلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ!
اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ!

اقبال اہل مدرسہ کی حقیقت یعنی اُس وقت کے مسلمانوں کے نظام تعلیم سے نالاں ہیں۔ وہ نظام تعلیم جو آج بھی جاری ہے۔ اقبال سمجھتے ہیں کہ اللہ سے دور کر رہا ہے۔ ایک طرف تو انگریزی سکولوں اور کالجوں کا نظام تھا۔ دوسری طرف ذاتی دینی مدرسوں کا نظام تھا۔ اقبال دونوں کے جسموں کو روحوں سے خالی سمجھتے ہیں کہ دونوں خدائے واحد کے قریب نہیں کر رہے۔ مدرسہ والوں نے نئی نسل کا گلہ گھونٹ دیا ہے۔ یعنی ان کے دل ان کے دماغ ان کی سوچ ان کی فکر کو ہی غلط رخ پر ڈال دیا ہے۔

اور دوسرے شعر میں کہتے ہیں دل کے معاملات کسی درویش بے گلیم وہ درویش نہیں جس نے عیاری کے لیے درویشی کا لباس گدڑی پہنی ہوئی ہے بلکہ وہ درویش جو گدڑی کے بغیر ہے یعنی جس نے درویش کا بہروپ نہیں بھرا ہوا۔ اس میں اقبال اپنی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جو بات اہل مدرسہ والوں پر عیاں نہیں وہ مجھ پر عیاں ہے میں بتاتا ہوں کہ لا الہ الا اللہ کی حقیقت کیا ہے۔

آخری شعر میں اقبال مدرسہ و خانقاہ کا اکٹھا ذکر غمناک لہجے میں کرتے ہیں۔ مدرسہ و خانقاہ دونوں جگہ نہ زندگی کی رمق ہے۔ نہ ان میں محبت ہے جو فاتح عالم ہے۔ نہ ان کے اندر معرفت ہے جو دلوں کو روشن کر دیتی ہے اور نہ ان کے اندر وہ نگاہ ہے۔ جو تقدیر بدل دیتی ہے۔

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔ اقبال ایک اور جگہ۔

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا!
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے!

اہل مدرسہ و خانقاہ دونوں ان اوصاف سے عاری ہیں۔ لہٰذا میں نے غمنا کی میں دونوں سے دوری اختیار کر لی۔ میں نم ناک اور غم ناک اس لیے ہوں کہ دونوں جگہ لوگ محبت کے لیے۔ معرفت کے لیے اور زندگی کے لیے اور نگاہ کے لیے آتے ہیں اور یہ مدرسہ و خانقاہ والے ان سے تہی دامن ہیں۔ لہٰذا آنے والوں کو یہ اوصاف تو نہ ملیں گے کچھ اور دے دیا جائے گا۔ اور آنے والے کو اس حقیقت کی خبر نہ ہوگی اور جب خبر ہوگی تو وہ خود ان جیسا بن چکا ہوگا۔ اس طرح یہ سلسلہ دراز اور مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہونے کے دکھ سے اقبال غمناک آنکھوں سے مدرسہ و خانقاہ سے چل دیے!

○

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں
خبر نہیں روش بندہ پروری کیا ہے!

جس امت کے اندر سے عدل اٹھ جاتا ہے وہاں ظلم کا نظام اپنی گرفت مضبوط کر لیتا ہے اور ظلم ہے ہی یہ کہ کس چیز کو ایسی جگہ رکھا جائے جس کے لیے وہ مناسب نہ ہو۔ جس امت کے اندر یہ نظام قائم ہو جائے پھر ہر طبقہ زندگی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ اقبال اہل مدرسہ اور خانقاہی نظام اور دوسرے طبقہ ہائے زندگی سے آزردہ ہیں کہ سب میں ظلم کا نظام ہے۔ جو جس مقام کے قابل نہیں وہ اس مقام پر براجمان ہے۔ جنھوں نے خود کو یا اُن کے چاہنے والوں نے اُن کو خواجگی کے مقام پر بٹھا رکھا ہے۔ مگر خواجگی کے مقام پر فائز ہستیوں کو بندہ پروری کے طریقوں سے نا آشنا ہی ہے۔ روش بندہ پروری سے نا آشنا خواجگی کا منصب سنبھالے ہوئے ہیں۔

○

پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے
کردار بے سوز! گفتار واہی!

اقبال ایک شعر میں نگہ بلند۔ جاں پر سوز اور سخن دلنواز میر کارواں کے اوصاف بتاتے ہیں۔ مگر اقبال اس شعر میں کہتے ہیں کہ میں نے پیر حرم یعنی کعبے کے شیخ جسے عام مسلمان اپنا دینی پیشوا اور رہنما جانتے ہیں۔ میں نے اس کو دیکھا ہے اس کا کردار حرارت اور تڑپ اور لگن اور شوق سے عاری ہے۔ پیر حرم کے کردار میں سوز نہیں گداختگی نہیں۔

اور اس کی گفتار یہاں اقبال نے واہی کا لفظ رکھ کر جو شدت بھر دی ہے۔ وہ اقبال کے دل کی تڑپ ہے اس تڑپ سے مجبور ہو کر واہی کا لفظ رکھا۔ گفتار واہی میں اقبال کی ناامیدی آخری درجے پر پہنچتی نظر آتی ہے۔ میر حرم کے سخن تو دلنواز ہونے چاہیے مگر وہ واہی کہنے والا ہے۔ پیر حرم کے نہ کردار میں سوز ہے اور نہ گفتار دلنواز ہے۔ باقی کیا بچا!

پیر حرم سے مراد دینی پیشوا اور رہنما ہے۔

○

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا!

محراب مسجد پر لکھا مصرعہ امام کو دکھانے کے لیے سمجھانے کے لیے ہے۔

قیام۔ رکوع۔ تشہد۔ سجدہ اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے وقت پر ادا کیے جائیں تو بندگی ہے۔

قیام کے وقت سجدہ اور رکوع کے وقت تشہد اور سجدہ کے وقت کوئی تشہد میں جا پہنچے تو!

زندگی میں بھی اسی طرح علم عمل، عشق اور جدوجہد اور تگ ودو اپنے اپنے مقام پر سجتے ہیں۔ یہاں اقبال نوحہ کناں ہیں کہ کر قیام کے وقت یہ ناوان سجدوں میں گر گئے۔ ان کا بے ترتیب اور بے نظم کردار بتاتے ہیں! اقبال مذہبی رہنماؤں کی نادانی یا پھر مفاد کی وجہ سے نادانی کا روپ اپنانے کا ذکر کرتے ہیں۔

○

یہ پیران کلیسا و حرم! اے وائے مجبوری!
صلہ ان کی کدو کاوش کا ہے سینوں کی بے نوری!
یقیں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی، کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

گرجے اور کعبے کے متولیوں کے بارے میں کیا کہا جائے۔ ان کی کاوش وسعی سے دل بے نور ہورہے ہین۔ اقبال پیران کلیسا اور حرم کا اکٹھا ذکر کرکے واضح کرتے ہیں کہ جس طرح پیران کلیسا نے عیسائیوں کو تباہی پر لگا دیا اور اب پیران حرم بھی یہی کررہے ہیں۔ بے عملی اور بے حسی کو عام کرتے ہیں۔ دل کی بے نوری اور بے حضوری کو اپنے عمل اور کردار اور کوشش سے عام کررہے ہیں۔

دوسرے شعر میں یقین پیدا کرنے کی بات کرتے ہیں یقین سے وہ درویشی ملتی ہے جس کے سامنے بادشاہی بھی جھکتی ہے۔ دوسرے مصرعے میں وہ کا لفظ رکھ کر درویشی میں بھی تخصیص کردی۔ عیاری والی درویشی نہیں بہروپ والی نہیں۔ یہ وہ درویشی ہے جس کے سامنے حکمرانی بھی بے حقیقت اور کم حقیقت ہے!

یدِ بیضا لیے ہوتے ہیں آستینوں میں، والی درویشی۔

○

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ مُلا ہے' نہ زاہد' نہ حکیم!

یہاں اقبال تاریخ انسانی پر نظر ڈالتے ہیں۔ ساری تاریخ میں عقل کی عیاریاں نظر آتی ہے۔ جس زمانے میں جو چیز نفع یا عہدہ دینے والی ہوتی ہے۔ عقل مند لوگ ویسے ہی بنتے نظر آتے ہیں۔ جس چیز سے نفع کی امید نہ ہو وہ چاہے کتنی اچھی ہو لوگ دور بھاگتے ہیں۔

عقل نفع ونقصان کے ظن وتخمین میں پھنسی رہتی ہے مگر عشق نمرود کی آگ میں کود جاتا ہے۔ عقل ابن زیاد بنا دیتی ہے۔ عشق حُر بنا دیتا ہے۔ اقبال بھی ملا کو زاہد کو حکیم کو عقل کے بندے قرار دیتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ اقبال عقل کے مخالف نہیں بلکہ اس عقل کے مخالف ہیں جو عیار ہے۔ اقبال درویشی کے خلاف نہیں اس درویشی کے مخالف ہیں جو عیار ہے۔ اقبال جانتے ہیں کہ حکومتوں اور بادشاہوں کی طرف سے ملاؤں اور زاہدوں اور فلسفیوں کو بڑے بڑے عہدے عنایت کیے جاتے ہیں اور یہ چلن عام ہو جاتا ہے تو ملا کا علم زاہد کا زہد اور فلسفی کا فلسفہ غایت اصلی نہیں رہتا بلکہ وسیلہ بن جاتا ہے۔ قاضی بننے کا۔ قاضی القضاۃ بننے کا۔ زہد کسی خانقاہ کا متولی بننے کا وسیلہ بن جاتا ہے فلسفی بھی دربار سلطان میں کرسی کی طلب کے لیے علم حاصل کرتا ہے۔ تو اصل غایت غائب ہو جاتی ہے بلکہ غرض منصب اہم ہو جاتی ہے۔ عشق ذاتی منفعت سے آلودہ نہیں ہوتا۔ ملا۔ زاہد اور فلسفی عیار لوگ ہیں یہ سب عیار ہیں۔ عیار اور مکار میں قریبی تعلق ہے بلکہ عیار مکار سے زیادہ خطرناک ہے۔

O

پیرِ حرم نے کہا سن کے مری رویداد!
پختہ ہے تیری فغاں؛ اب نہ اسے دل میں تھام
حلقۂ صوفی میں ذکر، بے نم و بے سوز و ساز
میں بھی رہا تشنہ کام، تو بھی رہا تشنہ کام!
آہ! کہ کھویا گیا تجھ سے فقیری کا راز
ورنہ ہے مالِ فقیر، سلطنتِ روم و شام!

پہلے شعر میں اقبال اپنی بات کے پختہ ہونے کی سند پیرحرم سے لیتے ہیں۔ وہ پیرحرم جو اقبال کا رزاداں ہے۔ خدائے واحد کی بندگی کرنے والا ہے۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

دوسرے شعر میں حلقہ صوفی کا ذکر کرتے ہیں اس سے پہلے بھی حلقہ صوفی سے غمناک اٹھنے کا ذکر کرتے ہیں۔ حلقہ صوفی میں ذکراذکار کا سلسلہ تو شب و روز ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔ مگر یہ ذکر بے نم ہوتا ہے۔ بے سوز ہوتا ہے۔ بے ساز ہوتا ہے۔ ذکر جن اوصاف سے مزین ہونا چاہیے یا ذکر سے جو خصوصیات ذکر کرنے والوں میں پیدا ہونی چاہئیں وہ پیدا نہیں ہوتیں۔ آنکھ نم نہیں ہوتی۔ دل سوز سے خالی رہتا ہے۔ اور ذہن میں جو اٹھان پیدا ہونی چاہیے حلقہ صوفی کے ساز سے وہ بلندی اور اٹھان بھی پیدا نہیں ہوتی۔ گویا ایک مشینی حرکت ہے۔ حلقہ صوفی کی حرکت بے نم ہے، بے سوز ہے، بے ساز ہے۔ میں اور تو حلقہ صوفی سے تشنہ کام ہی رہے کیونکہ ہم تو جن کی تلاش میں وہاں گئے حلقہ صوفی ان سے تہی دامن ہے۔

آخری شعر میں افسوس کے ساتھ اہل فقر سے کہتے ہیں کہ تجھ سے فقیری کا راز اور مقام کھو گیا ہے۔ وہ اس لیے کھویا گیا ہے کہ تو نے فقر کو ذریعہ بنالیا ہے۔ ذاتی خواہشات کی تسکین کا۔ ورنہ فقر والوں کے سامنے روم اور شام کی سلطنتیں ہیچ ہیں۔

O

مکتبوں میں کہیں رعنائیِ افکار بھی ہے؟
خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے؟

غالب نے:

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

غالب ایک شخص کے تصور کے سبب رعنائی افکار کا ذکر کرتے ہیں۔ اقبال شخص کے بجائے مکتبوں اور خانقاہوں سے فکر، سوچ اور علوم وفنون اور قوت نمو اور شوق پیدائی ختم ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ اور اہل مکتب سے آزدہ ہیں کہ ان کے مکتبوں میں افکار کی رعنائی ناپید ہے۔ پھر خانقاہوں کا ذکر کرتے ہیں کہ لذت اسرار خانقاہوں میں بھی نہیں ہے۔ دل اور دماغ۔ افکار کا تعلق دماغ سے ذہن انسانی سے ہے۔ مسلمانوں کے دور عروج میں چار دانگ عالم میں ان کی علمی برتری کا چرچا تھا۔ یورپ کے طالب علم ان مکتبوں اور جامعات میں پڑھنے آتے تھے۔ اور مسلمانوں ہی کے افکار کو بنیاد بنا کر یورپ نے سائنسی ترقی کی ہے۔

کتابیں اپنے آباد کی ...... وہ رعنائی افکار وہ تخلیق قوت اب مکتبوں میں نہیں یہ زمانے کے راکب نہیں رہے۔ ان میں فاعلی قوت نمو باقی نہیں رہی۔

خانقاہیں لذت اسرار اور دل کے معاملات کی نگہبان تھیں۔ سالکوں کو لذت اسرار سے لذت عشق سے لذت شوق سے سیراب کرتی تھیں مگر اب خانقاہوں میں وہ لذت نہیں ہے جو آنے والوں میں اسرار خودی کی لذت اور رموز بے خودی آشکار کر دیتی تھیں۔ غرض کہ مسلمانوں کے تربیتی اداروں کے زوال پر سوالیہ انداز میں جواب واضح کر دیا ہے!

○

رہا نہ حلقہء صوفی میں سوزِ مشتاقی
فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی!
خراب کوشک سلطان و خانقاہ فقیر
فغاں کہ تخت و مصلیٰ کمال زراقی!
کرے گی داورِ محشر کو شرمسار اک روز
کتابِ صوفی و مُلّا کی سادہ اوراقی!

شوق مشتاق:

میرے شوق دا نئیں اعتبار تینوں
آ جا ویکھ میرا انتظار آ جا
کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا
مشتاق اکھیں کتھے جا لڑیاں

حلقہ صوفی میں سوز مشتاقی نہیں رہ گیا۔ کہیں کھو گیا ہے۔ حلقہ بھی باقی ہے، صوفی بھی باقی ہے۔ مگر روح سے خالی بدن ہے۔ اب حلقہ کے لوگ صوفی کی کرامات کا ہی پرچار کرتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح سادہ مریدوں کو قابو کیا جاتا ہے۔ جو صوفی کی اصل تھی دل گداختگی۔ دل نوازی دلوں کو مصفا کرنا دلوں کو روشن کرنا وہ نہیں رہی صوفیوں کے تکیوں میں صرف پیروں کی کرامات کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ اقبال مسند صوفیا کے اپنے مرتبے مقام پر قائم نہ رہنے سے بہت آزردہ ہیں اور عام مسلمانوں کی فکر سوچ اور عمل کی خرابی کا سبب سمجھتے ہیں اس لیے بار بار اس خرابی کا دردمندی سے ذکر کرتے ہیں۔

دوسرے شعر میں پھر سلطان اور خانقاہ فقیر کو ملا کر کہتے ہیں کہ دونوں خراب ہو چکے ہیں۔ سلطان حکمران کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی سلطنت کے اندر عدل اور انصاف قائم کرے۔ ظلم اور

ناانصافی ختم کرے۔اسی طرح خانقاہ والوں کا بھی کام تھا کہ وہ مسلمانوں کے اندر محبت پیار انسانیت شرافت مساوات اور نیکی پیدا کرتے مگر خانقاہ والوں نے بھی علما کی طرح الگ الگ حلقے بنا لیے اور علما کی طرح ایک دوسرے کے مدمقابل آ گئے۔اقبال حلقہ صوفی کا زیادہ ذکر اس لیے کرتے ہیں کہ بے شک عام مسلمان پر علما کے فتوے تو عیاں تھے مگر فقر میں جو عیاریاں ہو رہی تھی اس سے ناواقف تھے اور اس دور میں عام مسلمانوں کا صوفیا پر اعتقاد بہت زیادہ تھا۔ اور ان کے اثرات بہت شدید تھے اور اہل حلقہ نہ چاہتے تھے کہ عام مسلمان ہماری صوفیانہ سلطانی سے نکل جائیں۔اس لیے اقبال سلطانی اور فقیری کو باہم ملا کر ذکر کر رہے ہیں۔ دوسرے مصرعے میں کہتے ہیں کہ آہ و فغاں کا مقام ہے کہ تخت اور مصلی (تخت سے مراد اہل تخت اور مصلی سے مراد اہل مصلیٰ ہے) دونوں مکروفریب سے کام لے رہے ہیں۔ عام مسلمانوں کے لیے ایک نے سلطانی کے نام سے اور ایک نے مصلیٰ کے نام پر مکروفریب کا جال بچھا رکھا ہے۔تیسرے شعر میں پھر صوفی وملا کا ذکر ہے۔اک روز یعنی محشر کے روز داورِ محشر یعنی رسول کریم کو شرمسار کرے گی وہ صوفی و ملا کی کتاب کی سادہ اوراقی ہوگی۔ جو کتاب کراماً کاتبین لکھتے ہیں۔روزِ محشر صوفیوں اور ملاؤں کی کتاب سامنے آئے گی۔

اقبال بار بار اس مرض کو جو مسلمانوں کو لاحق ہے ذکر کرتے ہیں کہ مرض سے آگاہ ہونے کے بعد ہی اسے دور کیا جا سکتا ہے۔اس کا علاج کیا جاتا ہے۔

○

مئے یقیں سے ضمیرِ حیات ہے پرسوز
نصیب مدرسہ یا رب یہ آب آتشناک!

انسانی زندگی میں جو سوز و گداز ہے یہ یقین کی شراب کی وجہ سے ہے۔شراب یقین کو ایسے پانی سے تشبیہ دیتے ہیں جس میں آگ بھری ہو (خدا کی بنائی اس کائنات میں انسان چیزوں کو تضاد اور مماثلت سے سمجھتا ہے) ایسا پانی جس میں آگ ہو بظاہر ناممکن لگتا ہے۔

بادل میں پانی اور آگ دونوں باہم ملے ہوتے ہیں۔اقبال خدا سے دعا کرتے ہیں کہ مئے یقین جو ضمیر حیات کو سوز وگداز سے بھر رکھتی ہے۔وہ مدرسہ والوں کو بھی نصیب ہو۔دوسرے لفظوں میں اہل مدرسہ مئے یقین سے تہی دامن ہیں اور اسی وجہ سے ان کی زندگیوں میں سوز و گداز نہیں ہے۔

O

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے!

کاسہ گدائی بادہ ناب مدرسہ اور خانقاہ۔شراب ناب خالص شراب سے مراد وہ پیغام حقیقی ہے جو ملت اسلامی کے ہر فرد کے دل کو نئی زندگی بخش دے وہ پیغام خالص حالت میں اصل صورت میں صرف میں اقبال اپنی مقدور بھر کوشش سے دے رہا ہوں اور اس کو ہی غنیمت سمجھو۔ چونکہ آج کل اصل خالص پیغام کا قحط ہے اور قحط کے زمانے میں کم چیز بھی زندگی کا سامان بن جاتی ہے۔میرا اقبال کا پیغام غنیمت سمجھ کر لے لو۔کیونکہ اہل مدرسہ اور خانقاہ دونوں جگہ سے یہ بادہ ناب نہ ملے گا۔کیونکہ یہ مدرسہ اور خانقاہ والوں کے پاس ہے ہی نہیں۔تمھیں کیا دیں گے۔ اب تمھاری مسلمانوں کی زندگی اس میں مضمر ہے کہ جو تھوڑی بہت مرے کاسہ میں خالص شراب ہے لے لو یہ بادہ ناب تمھاری زندگی کی بہتری کا سبب بنے گی!

اقبال مسلمانوں کے دونوں اداروں مدرسہ اور خانقاہ کی روحانی ویرانی کا ذکر کرتے ہیں۔ویسے تو لاکھوں مسلمان روزانہ زیارت کرنے آتے ہیں مگر حقیقی روحانی زندگی اور شراب معرفت سے بے بہرہ رہتے ہیں کیونکہ مدرسہ اور خانقاہ شراب معرفت سے خالی ہیں۔

○

یہ مدرسہ یہ جواں، یہ سرُور و رعنائی
انہیں کے دم سے ہے میخانہ فرنگ آباد!
نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت! وہ اندیشہ و نظر کا فساد!
فقیہہ شہر کی تحقیر! کیا مجال مری
مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد
کیے ہیں فاش، رموزِ قلندری میں نے
کہ فکر مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد!
رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمیؑ ہے کارِ بے بنیاد!

سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے دم سے افرنگیوں کے مے خانہ میں رونق ہے۔ کہ یہ ادارے مدرسے ایسی کھیپ تیار کر کے مختلف اداروں میں بھیج دیتے ہیں جو ذہنی اور معاشی حوالے سے ان کی برتری قبول کر کے اپنی کم تری کے مرض میں مبتلا ہیں۔ یہ مدرسے اور ان مدرسوں میں پڑھنے والے جوان اور ان میں جو سرور رعنائی ہے یہ رعنائی فکر نہیں بلکہ یہ سرور بھی مدہوشی والا ہے اور رعنائی بھی ظاہری بناؤ سنگھار والی ہے۔ شعر کی ساری دلالتیں ظاہر داری کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اقبال کی نظر میں افرنگ خود ظاہر ہی ظاہر ہے بدن ہی بدن ہے روح اور فکر سے عاری ہے۔

دوسرے شعر میں فلسفی اور ملا کا ذکر کر کے ایک کو اندیشہ و نظر کا فساد اور ایک کو دل کی موت قرار دیتے ہیں اسی وجہ سے کہ یہ مسلمانوں کو خراب کرنے والے ہیں ان سے اقبال کچھ تعلق رکھنے کے روادار نہیں۔

تیسرے شعر میں فقیہ شہر کا ذکر کرتے ہیں۔ فقہ جاننے والا مفتی فتوی دینے والا تعزیر لگانے والا۔ میں اقبال اس کی تحقیر توہین کروں میری کیا مجال ہے وہ تو سرکاری منصب دار ہیں اور اقبال فقیہہ شہر کی دل تنگی سے افسردہ ورنجیدہ ہیں کہ دلنواز نہیں ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کن لفظوں میں مرض کی تشخیص کی جاسکتی ہے۔

آخری سے پہلے شعر میں اقبال پھر مدرسہ وخانقاہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اقبال جانتے ہیں کہ مدرسہ وخانقاہ کس طرح عام مسلمانوں کی زندگیوں اور فکر اور عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور کس رخ سے نئی نسل کی تربیت کر رہے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ اقبال کا قلندر ایام کا راکب ہے۔ مرکب نہیں۔ اقبال کے ہاں نباتات و جمادات تقدیر کے پابند ہیں۔ قلندر صرف احکام خدا کا پابند ہے۔ قلندر جز دو حرف لا اور الہ کے علاوہ کچھ نہیں جانتا ہے۔ قلندر اللہ کے سوا سب الہٰ کا انکار کرتا ہے۔ ان رموز قلندری کے فاش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ فکر مدرسہ وخانقاہ آزاد ہو۔ چونکہ فکر مدرسہ وخانقاہ مکروفریب اور عیاری اور شکم پروری میں قید ہو چکی ہے۔ اور قلندر یہ چاہتا ہے کہ مدرسہ وخانقاہ والے شکم پروری سے آزاد ہوں تب ہی ان کے فکر اور کردار میں پختگی آئے گی اور پھر عام مسلمانوں کے فکر اور عمل میں بہتری کی توقع ہے۔ اقبال مدرسہ وخانقاہ میں وہی روح جو زندگی اور جدوجہد اور ایام کا راکب بننے والی ہے دیکھنے کے خواہش مند ہیں! آخری شعر میں عصا کے بغیر کلیمی کے بے بنیاد ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔

O

میں جانتا ہوں انجام اس کا

جس معرکے میں ملا ہوں غازی!

اس شعر میں غازی اور معرکے کے الفاظ مُلا کے ساتھ مل کر بحث وتمحیص اور فتوی سازی اور دشنام اور تفرقہ بازی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اور اگر ملاؤں کو معرکہ جنگ میں لے جائیں تو غازی ہی لوٹیں گے۔ اس شہر میں اقبال ملاؤں کے ذمے جو کام بھی لگایا جائے اس کو ٹھیک طرح نہ کرنے کا ذکر کرتے ہیں یہ جنگ لڑے بغیر ہی غازی بن کر لوٹ آئیں گے کہ مُلا گفتار کے عادی ہیں اور معرکہ عمل کا میدان ہے۔ ملاؤں کے عمل سے عاری ہونے کا ذکر ہے۔

○

تیری طبیعت ہے اور تیرا زمانہ ہے اور
تیرے موافق نہیں خانقہی سلسلہ!
دل ہو غلامِ خرد یا کہ امامِ خرد!
سالک رہ ہوشیار! سخت ہے یہ مرحلہ

غلام رسول مہر اس شعر کے مطالب میں لکھتے ہیں:

''اے موجودہ دور کے مسلمان! تیری طبیعت کا رنگ بھی اور ہے اور تیرا زمانہ بھی بدلا ہوا ہے۔ خانقاہی سلسلہ تیرے موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ مطلب یہ کہ ممکن ہے اس سلسلے نے کسی زمانے میں خلق خدا کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہوں۔ مگر موجودہ زمانے کے تقاضے دوسرے ہیں اس سلسلے سے کام لے کر خدمت انجام دینا ممکن نہیں۔''

دوسرے شعر میں اقبال سالک رہ کو خبردار کرتے ہیں تم جس سفر پر ہو بڑا سخت مرحلہ ہے۔ اس میں بڑے بڑے اُدھر جا پڑتے ہیں۔ چاہے دل کو رہنما بنائیں چاہے عقل کو رہ نما بنائیں۔ عقل بھی ٹھوکر کھا سکتی ہے۔ اور عموماً کھا جاتی ہے۔ عقل عیار ہے مگر دل ... دل کے معاملات بھی بڑے نازک ہے۔ دل میں اپنی پارسائی نیکی اور پہنچے ہوئے ہونے کا غرور آتے ہی سالک لڑک جاتا ہے۔ اس لیے سالک رہ کو سلوک کی رہ پر نکلنے والے راہی کو بے شک وہ دل کا غلام ہے اور بے شک وہ عقل کا غلام ہے اس سخت اور مشکل سفر سے ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے سالک کو خبردار کرتے ہیں۔ ایک اور جگہ اقبال کہتے ہیں۔

صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

○

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی!
دیا ہے میں نے انہیں ذوقِ آتش آشامی
حقیقت ابدی ہے مقام شبیریؓ!
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی!
عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں
شکوہِ سنجر و فقر جنیدؒ و بسطامیؒ!

پہلے شعر میں اقبال اپنی ندا سے عارفوں اور عامیوں کے زندہ ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔اقبال یہ واضح کرتے ہیں کہ مدت سے عارفوں پر پہلے اوران کے اثر سے عامیوں پر مردنی چھا چکی تھی۔میری نوا سے پھر ان کے دل میں ذوق آتش آشامی پیدا ہوا۔معرفت کی تیز شراب پینے کا ذوق ان میں میرے نغموں سے پیدا ہوا۔وہ حرارت، وہ گرمی، وہ آتش جو زندگی کی علامت ہے وہ عارفوں عامیوں میں ختم ہو چکی تھی جسے میرے نغموں نے پھر جگا دیا۔

دوسرے شعر میں حضرت امام حسینؓ کا نام حقیقت ابدی ہے۔کوفی وشام بدلتے رہتے ہیں۔

تیسرے شعر میں اقبال خواہش کرتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ ملت اسلامیہ کو پھر سنجر جیسا پُر شکوہ حکمران اور حضرت جنیدؒ اور حضرت بایزیدؒ جیسے صاحب فقر نصیب ہوں۔اقبال تصوف کے مضر اثرات سے نالاں ہیں کیونکہ عام مسلمان اہل فقر سے بہت اثر پذیر تھے۔اس طرح مستی کاہلی، نامرادی عامیوں میں پیدا ہو گئی۔مگر اقبال امید کرتے ہیں کہ دوبارہ حضرت جنیدؒ اور حضرت بایزیدؒ جیسے اہل فقر مسلمانوں میں پیدا ہوں گے جو مسلمانوں میں بلند کردار پیدا کریں گے۔

○

کس کو معلوم ہے ہنگامہء فردا کا مقام
مسجد و مکتب و مئے خانہ ہیں مدت سے خموش!
صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش!

ماضی حال مستقبل۔ جو امتیں زوال پذیر ہوتی ہیں۔ وہ ماضی کا فخر یا ماتم کرتی رہتی ہیں اور حال سے مطمئن اور مستقبل سے بے خبر ہوتی ہیں۔ یہاں اقبال یہی فرما رہے ہیں کہ مسجد اور مکتب اور مئے خانہ والے تو آنے والے کل کے ہنگاموں سے بے خبر ہیں اور مدت ہوئی ان پر خاموشی موت کی علامت طاری ہے۔ یہاں مسجد سے مراد علما اور مکتب سے درس گاہیں اور مئے خانے سے مراد خانقاہیں جو شراب معرفت پلانے کی دعویدار ہیں۔ نہ علما اور نہ ہی اہل مدرسہ اور نہ ہی خانقاہ والے زندگی کے تقاضوں اور دین کی حقیقت سے آگاہ ہیں کیونکہ مدت سے یہ دین حجازی کے بجائے عجمی انداز اپنائے ہوئے ہیں۔

دوسرے شعر کی وضاحت میں مولانا مہر کہتے ہیں۔ ''ساز بجانے والے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے اوپر غفلت طاری نہ ہونے دے۔ یہ نہ سمجھ لے جو نغمے طبیعت سے اٹھتے ہیں وہ سب کے سب درست ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے سر تال غلط بھی ہو جاتے ہیں یعنی انسان جن چیزوں کو ندائے غیب سمجھتا ہے، ان کا مطلب سمجھنے یا پیش کرنے میں غلطی کر جاتا ہے۔'' امت مسلمہ کی تاریخ میں کئی مثالیں میں جس میں کئی نے ندائے غیب کے سننے کا اظہار کیا ہے۔ اسی مقام کے لیے اقبال ہوشیار کرتے ہیں کہ ذرا سی غفلت میں سالک دوسری طرف جا پڑتا ہے۔ اور پھر ...! اس کے پیرو کار بھی!

○

تھا جہاں مدرسۂ شیری و شاہنشاہی
آج ان خانقہوں میں ہے فقط رو باہی!

اقبال ماضی اور حال کا موازنہ کرتے ہیں۔ خانقاہیں گذرے وقت میں شیری اور شہنشاہی کی وارث تھیں مگر آج وہاں لومڑی کی عیاری اور مکاری کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کی وضاحت میں بیسیوں واقعات لکھے جا سکتے ہیں مگر اقبال نے دو سطروں میں خانقاہوں کی پوری تاریخ کو سمیٹ لیا ہے۔ اوران کے موجودہ کردار کو لومڑی کی عیاری اور مکاری قرار دیا ہے ایک اور جگہ۔

عیاری کا درویشی لباس پہن لینے کا ذکر کرتے ہیں۔

○

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر' فقر ہے شاہوں کا شاہ
عِلم کا مقصود ہے پاکیِ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ
علم فقیہہ و حکیم' فقر مسیح و کلیم
عِلم ہے جو یائے راہ' فقر ہے دانائے راہ
فقر مقامِ نظر' عِلم مقامِ خبر
فقر میں مستی ثواب' علم میں مستی گناہ!
علم کا 'موجود' اور ' فقر کا 'موجود' اور

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ!
دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو
تیری نگہ توڑ دے آئنۂ مہر و ماہ!

فقر بلند مرتبے اور مقام کا نام ہے اقبال نے تھوڑے لفظوں میں بتا دیا ہے فقر کے معجزات کیا ہیں اور فقر کا مقصود کیا ہے۔ فقر کا کام کیا ہے۔ اقبال علم اور فقر کے درمیان جو فرق ہے اس کا بیان کرتے ہیں علم کو رد نہیں کرتے علم مقام خبر ہے اور فقر مقام نظر ہے۔ خبر سے اگلی منزل نظر کی ہے۔ علم فقیہ وحکیم ہے اور فقر مسیحؑ و کلیمؑ۔ علم عقل وخرد کی پاکی کا طلب گار ہے فقر عفت قلب ونگاہ کا وارث ہے۔ اللہ کی واحدنیت کا اقرار علم اور انداز سے کرتا ہے اور فقر اور انداز میں، اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال وہ جنھوں نے عیاری سے فقر اور درویش کا لباس پہن لیا ہے اُن سے کیوں نالاں ہیں اور نالہ وفریاد اور آہ وزاری کرتے ہیں، فقر جیسی بلند ترشے کو جب ہر عامی نے اپنا لیا جو اس کے قابل نہ تھا تو اقبال کے فکر نے کئی کئی رنگ میں کئی کئی انداز میں اس کی کلعی اتاری اور اصل فقر کا مقام بھی ہمیں بتا دیا اور حقیقی اہل فقر کی شان بھی ہمیں جتادی!

○

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لیے
کہ یک زباں ہیں فقیہان شہر میرے خلاف

مسلمانوں کے دور زوال میں علما کا اتفاق ایک خواب وخیال ہو گیا ہے۔ اور مومن اس بات پر ہر وقت رنجیدہ خاطر رہتے ہیں کہ ہمارے علما کرام میں اتفاق نہیں ہے۔ ہر وقت لڑتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو غلط ٹھہراتے رہتے ہیں۔ مگر اقبال کے خلاف تمام علما اکٹھے ہو گئے ہیں ایک زبان ہم زبان ہو گئے ہیں۔ جس کام کی مسلمانوں کو توقع نہ تھی خواہش تھی وہ ہو گیا

ہے۔تمام علما کرام ہم آواز ہو کر اقبال کو کیا کچھ کہہ رہے ہیں لہٰذا مسلمانوں کو مبارک ہو!

یہ اقبال کا ہی کمال ہے کہ علما کرام کے رویے اور کردار کو اس طرح واضح کر دیا ہے۔اقبال کے خلاف فتوؤں سے سب آگاہ ہیں۔

O

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا
مسائلِ نظری میں الجھ گیا ہے خطیب!

مسائل کی بڑی دو قسمیں ہیں نظری اور عملی۔مسائل نظری فلسفہ اور حکمت کا موضوع ہیں اور عموی طور پر عام مسلمانوں کی عملی زندگی سے تعلق نہیں رکھتے۔زمین سے ماورا باتیں ان کا موضوع بحث ہوتی ہے۔عملی زندگی سے ان کا تعلق کم ہی ہوتا ہے۔اور خطیب بھی مسائل نظری میں الجھا ہوا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مسائل نظری کو بھی حل نہیں کر سکا۔کیونکہ اس میں اتنی اہلیت ہی نہیں کہ ان کو حل کر سکے۔اس لیے خطیب ان میں الجھا ہوا ہے۔اور مسلمانوں کی جماعت خطیب کی طرف دیکھ رہی ہے کہ وہ اُن کو عملی زندگی میں آگے بڑھائے۔جس جماعت کا رہبر و رہنما ہی مسائل نظری میں الجھ چکا ہو وہ جماعت کو کب اور کیسے منزل تک پہنچائے گا اور ایسے سرگرم سفر قافلوں کا انجام سب جانتے ہیں جس کے ناخداؤں کا ذہن الجھا ہوا ہو۔اور اپنے مقلدین کو بھی الجھایا ہوا ہے۔جماعت سے مراد امت مسلمہ ہے!

قطعہ

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات!
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات!

اس قطعے کا پہلا شعر تو زبان زد عام و خاص ہے۔اقبال کے اکثر اشعار کی طرح۔مگر قطعے کے دوسرے دونوں اشعار جب تک نہ پڑھیں پتہ نہیں چلتا کہ اقبال کیا بات مسلمانوں کے دل میں اتارنا چاہتے ہیں فلک نہیں افلاک زمین آسمان نہیں کائنات کی وسعتوں میں تکبیر مسلسل کہی جائے اللہ کی بڑائی بزرگی واحد۔احد۔مالک۔خالق۔مالک کل مالک کن ہونے کی صدا مسلسل کائنات کی وسعتوں میں گونجتی رہے۔

یا پھر خاک کی آغوش میں بیٹھ کر تسبیح پڑھی جائے۔مناجات کی جائے۔پہلے مصرعے میں بلندی ہے بڑائی ہے پرواز ہے۔بلند آہنگی ہے۔دوسرے مصرعے میں پستی ہے خاک سے ملاپ ہے۔سکون ہے۔ٹھہراؤ ہے۔تیسرے شعر پر آ کر اقبال دونوں طریقوں کا فرق واضح کرتے ہیں کہ افلاک کی وسعتوں میں تکبیر مسلسل کہنے والا ایسے مردوں کا مذہب ہے جو خود سے آگاہ ہیں اور خدا مست ہیں۔یہاں مستی خود فراموشی نہیں بلکہ احکام خدا کی مکمل پاسداری ہے۔

خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات کرنے والوں کا مذہب ملا، جمادات اور نباتات کا مذہب ہے۔ان کا پیوند خاک سے ہے۔ جمادات اور نباتات کی زندگی کی جڑت خاک سے ہے اور ملا بھی جمادات اور نباتات ہی کی طرح ہے۔ فیصلہ خود کریں کہ مردان خود آگاہ و خدامست کا کیا مقام ہے۔اور ملا کو کس سے جاملایا ہے۔

رباعیات

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری
رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ
نہیں ممکن امیری بے فقیری!

ملت اسلامیہ میں نہ کوئی مومن نظر آتا ہےاور نہ ہی مومن کی امیری نظر آتی ہے۔صوفی تو نظر آتے ہیں مگر ان میں جو روشن ضمیری ہوتی تھی۔ وہ ان صوفیوں میں نظر نہیں آتی۔ گویا جسم ہے روح موجود نہیں ہے۔ یہ وقت دعا ہے۔ خدا سے پھر وہی پہلے والا دل اور پہلے والی نظر مانگ۔

یارب! دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے

جب تک ایسا دل اور ایسی نظر نہ ملے گی تب تک اے صوفی تیرے ضمیر میں روشنی نہ پیدا ہوگی۔ اور جب یہ قلب و نظر والی فقیری ملے گی تو امیری جو مومن کی میراث ہے وہ مل جائے گی۔

اقبال اس رباعی میں بھی صوفی کو خالی برتن کہہ رہے ہیں۔ روح سے خالی بدن!

○

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے!
وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے!
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہے تو باقی نہیں ہے!

یہاں خطاب تمام امت مسلمہ سے ہے۔ تیری رگوں میں وہ لہو باقی نہیں وہ آبا کی طرف اشارہ ہے۔

وہ زمانے میں معزز تھا مسلماں ہوکر

اور تیرے وجود میں وہ دل بھی نہیں ہے اور اس دل میں وہ آرزو بھی نہیں ہے۔ رگ۔ لہو۔ دل۔ آرزو۔ پر غور کریں۔ نماز بھی پڑھ رہا ہے۔ روزہ بھی رکھ رہا ہے۔ قربانی بھی مہنگی سے مہنگی دے رہا ہے۔ حج اور پھر حج کر کے الحاج ہو گیا ہے مگر تو باقی نہیں ہے۔ اس مصرعے میں سارا زور کسی خاص چیز کے کھو جانے پر ہے۔

عبادت جب عادت بن جائے۔ عبادت سے اس کا مغز نکل جائے۔ تو ایسے ہے جیسے بندے سے بندگی چھن جائے تو بھی وہ دو ٹانگوں پر چلنے والی مخلوق کے طور پر تو وجود رکھتا ہے مگر بندگی۔ انسانیت کے حوالے سے اس کا وجود اور عدم برابر ہے۔ نماز روزہ حج اور قربانی بذات خود مقصد نہیں بلکہ ایک بڑے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ جب تم نے ان کو مقصد قرار دے لیا تو اُن کی روح سلب ہو گئی۔ وہ تیری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اقبال کی شاعری مسلمانوں کی زبوں حالی پر تڑپنے کا نام ہے۔

فرشتوں کا گیت

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست' تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی' خواجہ بلند بام ابھی

خلق خدا کی گھات میں رند بھی ہے فقیہ بھی میر بھی اور پیر بھی اے رب کریم تیرے جہان میں گردش صبح وشام وہی ہے۔ یعنی خلق خدا کا شکار جاری ہے۔ یہاں اقبال نے معلوم تاریخ کی کہانی کہہ دی ہے۔

دنیا میں امیر مال دولت میں مست ہیں انھیں خلق خدا کا کچھ خیال نہیں فقیر اپنے حال میں مست ہیں۔ ان فقیروں کو اپنے حال کی بھی خبر نہیں۔ اور خلق خدا بھی بندہ بھی ابھی کوچہ گردی کر رہا ہے۔ اپنے اصل ٹھکانے تک اصل منزل تک نہیں پہنچا بندہ جس کی منزل بندگی ہے ابھی تک بندہ نے بندگی اختیار نہیں کی۔ اور خواجہ بھی بلند بام ہے۔ خلق خدا سے باہم تعلق نہیں رکھتا۔ بلند مسند پر براجمان ہے۔ غرض اقبال مسلمانوں کی مجموعی حالت وکیفیت کا بیان کر رہے ہیں۔ وہ بھی فرشتوں کی زبان ہے!

رند، فقیہہ، میر، پیر خلق خدا کو لوٹ رہے ہیں، نوچ رہے ہیں۔ اہل فقرا اپنے آپ میں مست ہیں۔ خواجہ بلند مرتبے پر فائز ہے۔ خلق خدا لٹ رہی ہے۔ بندہ یعنی عام انسان ابھی حقیقت حال سے ناواقف وناآگاہ ہے!

فرمانِ خدا

(فرشتوں سے)

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

مذہبی پیشواؤں خصوصاً پادریوں نے خدا اور اس کے بندوں کے درمیان پردے تان دیے ہیں۔ وہ اپنے واسطے کے بغیر کسی کو خدا تک نہیں پہنچنے دیتے۔ ان مذہبی پیشواؤں کو کلیساؤں سے اٹھا دو تا کہ بیچ کے پردے بھی اٹھ جائیں۔ خدا اور بندوں کے درمیان براہِ راست تعلق پیدا ہو جائے۔

یہ شعر دراصل مسیحی کلیسا کی سرگزشت کا ایک نہایت اہم باب ہے۔ اہل کلیسا تمام مذہبی معاملات کے مختار خود بن گئے تھے۔ صدیوں تک دنیا نجات کے لیے ان ہی کی طرف دیکھتی رہی جب علم پھیلا عوام کے دماغوں میں روشنی پیدا ہوئی تو نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ نہ صرف کلیسا سے بدظن ہوئے بلکہ مذہب ہی سے بیزار ہو گئے۔ بالکل یہی کیفیت ہندو دھرم کے پنڈتوں اور پروہتوں نے پیدا کی اور ایسی ہی حالت ہماری قوم کے نام نہاد عالموں اور پیروں کی بھی ہے۔

اقبال یہاں کلیسا کا ذکر کر کے مسلمانوں کو خبردار کر رہے ہیں کہ جس طرح پیران کلیسا نے مسیحی تعلیم مسخ کر کے اپنی حکمرانی قائم کر لی تھی۔ جس بات کو اپنے مفادات کے خلاف جانتے اس کو مسیحی تعلیم کے خلاف قرار دے کر مردود قرار دے دیتے۔ آج کل اہل یورپ اس

زمانے کو تاریک دور Dark ages کے نام سے یاد کرتے ہیں۔عیسائی پادریوں کے ظلم کی داستان بڑی لمبی اور کالی ہے۔اقبال کا خطاب امت مسلمہ سے ہے۔اقبال بتاتے ہیں کہ مسیحی پادریوں نے خود کو اور مسیحی تعلیم کو ایک قرار دے لیا تھا۔اسی طرح برہمنوں نے اور پروہتوں نے بھی اپنے مفادات سے ٹکراتے لوگوں کو مردود قرار دے کر تباہ کر دیا۔اقبال واضح کرتے ہیں کہ پیران کلیسا نے کلیسا کے آڑ میں جو من مانیاں کیں وہ مسیحی تعلیمات نہ تھی۔اس کا ردعمل ہوا اور پیران کلیسا کو کلیسا سے نکال دیا گیا۔خدا اور بندے کے درمیان کوئی پردہ کیوں حائل ہو!

maablib.org

ذوق وشوق

جلوتیانِ مدرسہ کورنگاہ و مردہ ذوق
خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدُو!

اس نظم کے اکثر اشعار فلسطین میں لکھے گئے جہاں وہ دسمبر 1931ء میں عالمی مسلم کانگرس کی شرکت کے لیے گئے تھے ... نظم کے ابتدائی بند میں قصیدہ بردہ کے پہلے دو شعروں کی تلمیحات بھی موجود ہیں۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ نظم دراصل حضرت رسول اکرمؐ کے عشق میں لکھی گئی۔

اس نظم کا شعر ہے۔

لوح بھی تو' قلم بھی تو' تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

ایک اور شعر

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل، غیاب و جستجو؛ عشق، حضور و اضطراب!

اس نظم میں بھی اہل مدرسہ و خانقاہ کی کورنگاہی اور بے ذوقی۔ تہی دامنی اور کم طلبی کی بات اقبال کرتے ہیں۔

جلوتیاں مدرسہ کی نگاہیں کور ہیں کہ انھیں نظر نہیں آتا۔ آنکھیں ہیں نظر کام نہیں کرتی اور

ان میں ذوق وشوق بھی مردہ ہو چکا ہے۔ خلوتیاں اہل خانقاہ کے سبو بھی عشق الٰہی کے ذوق سے خالی ہیں اوران کے اندر عشق الٰہی کی شراب کی طلب بھی کم ہو چکی ہے۔ مراد یہ کہ دونوں طبقے اپنے اصل مقام سے دور جا پڑے ہیں۔ اہل شریعت اور اہل طریقت دونوں اصل مقصد اور اعلیٰ مقام سے دور ہو گئے ہیں۔

maablib.org

جاوید کے نام

ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبالؔ
کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ!

غلام رسول مہر۔

'اقبال کسی خانقاہ میں ٹھہر نہ سکا۔ اس لیے کہ وہ خوش طبع خوش فکر اور صاحب ذوق تھا۔ اور اس کا دماغ شگفتہ ہے پژمردہ نہیں'

مطلب یہ کہ آج کی خانقاہوں میں خوش طبعی خوش فکری اور خوش ذوقی کو نا پسند کیا جاتا ہے اور نہ یہ خاصیتیں وہاں پنپتی ہیں۔ وہاں تو ایسے ہی لوگ رہ سکتے ہیں جن کے دماغ خشک ہیں۔ ان میں کوئی اچھا خیال نہ سما سکے۔ اور خوش طبعی سے انھیں کوئی مناسبت نہ ہو۔ ان کے دل مردہ ہوں جن میں لذت کی لپک نہ ہو۔

مُلاّ اور بہشت

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرتِ مُلاّ کو ملا حکمِ بہشت!
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حُور و شراب ولبِ کشت!
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول!
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت!
ہے بد آموزیِٔ اقوام و مِلَل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد' نہ کلیسا' نہ کُنشت!

اقبال کا خطابیہ انداز اپنے اندر ڈرامہ سموئے ہوئے ہوتا ہے۔ چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ ان چار شعروں کو پڑھ کر ایک مختصر ڈراما بنتا ہے۔ حق تعالیٰ نے حضرت ملا کو بہشت میں جانے کا حکم دیا۔ اقبال بھی وہاں موجود ہیں ان سے ضبط سخن نہ ہوسکا اور دست بستہ اللہ سے عرض کی کہ آپ اسی لڑاکو جھگڑالو ملاّ کو جس کی سرشت میں لڑائی جھگڑا اور قوموں اور بندوں کو غلط تعلیم دینا ہے۔ جنت میں جانے کا حکم دے رہے ہیں۔ یہ جنت میں خوش نہ رہے گا کیونکہ حور اور شراب پاکیزہ اور سبز سبزہ سے اسے رغبت نہیں ہے۔ اسے تو لڑائی جھگڑے کے لیے مسجد، کلیسا اور بت خانہ چاہیے۔ ان چار اشعار میں اقبال نے ملاؤں کی لڑائی جھگڑے کی پختہ ہو چکی عادت کو واضح کیا ہے۔ قوم اور ملت کے نوجوان کو غلط تعلیم دینے کی ان ملاّ ؤں کو عادت ہے۔

ظاہر ہے یہ ملا جنت میں کیسے خوش رہے گا اور جنت قال واقوال اور جھگڑے کا مقام نہیں ہے۔ ایک دوسرے کے رد میں جو کتابیں لکھی جاتی ہیں اس میں جس کا رد لکھا جا رہا ہو وہ قال کے عنوان اور جو رد لکھ رہا ہو وہ اقوال کے عنوان سے لکھا جاتا ہے۔اور جنت میں تو کسی کے رد کے لیے کتابیں لکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔غرض اقبال ملاؤں کی پختہ ہو چکی عادت اور ملت اور قوم کے بچوں کو غلط تعلیم دینے کا ذکر کرتے ہیں۔

ساقی نامہ

تمدن، تصوف، شریعت کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام!
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی
لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب!
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں اُلجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا، حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ، اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

ساقی نامہ سات بند پر مشتمل ہے۔اس کے ہر بند میں کسی ایک مضمون پر اظہار فکر کیا ہے۔ پہلے بند میں پیار کا نقشہ دوسرے میں انقلابات زمانہ اور مسلمانوں کے غیر اسلامی اعمال

اور سوچ کا ذکر کیا ہے۔ تیسرے بند میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے۔ چوتھا بند زندگی (ذ ما دم رواں ہے زندگی) کے بارے میں ہے پانچویں بند میں بھی زندگی ہی کا ذکر ہے۔ چھٹے اور ساتویں بند میں بھی خودی ہی کے بارے میں بیان ہے۔ اس نظم میں اقبال نے اپنے دور اور حالات اور مسلمانوں کے زوال کا نوحہ لکھا ہے اور پھر اس سے نکلنے کے لیے خودی کی تلوار سے کام لینے کا علاج بھی تجویز کیا ہے۔ اقبال نے دردمند دل سے مسلمانان عالم اور خاص کر ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی اور مسلمانوں کے رہبروں کے کھو جانے کا ذکر کیا ہے۔ ساقی نامے کے ایک ایک شعر پر کئی صفحے اس کے محاسن کے ذکر میں لکھے جا سکتے ہیں مگر ہم اقبال کی فکر کے بارے میں اپنی کم ہمتی کی وجہ سے مختصر بیان کریں گے۔ دوسرے بند میں دور حاضر کے انقلابات کا ذکر ہے اور دل سوزی کے ساتھ مسلمان اور ان کے رہبروں رہنماؤں کے کردار کا ذکر ہے۔

اس میں اقبال نے مسلمانوں کی تمدنی اور مذہبی زندگی اور علم الکلام اور تصوف اور شریعت کو بتان عجم کے پجاری کہا ہے۔ اقبال اسلامی معاشرے اور اسلامی احکامات کو خالص اسلامی اور عربی صورت میں دیکھنے کے شدید خواہش مند ہیں۔ اور عجمی علوم و فلسفہ و تصوف و علم الکلام نے جو اثرات اسلامی شریعت۔ اسلامی تمدن اور تصوف پر ڈالے اقبال اِن کو بتان عجم کہتے ہیں۔

دوسرے شعر میں انتہائی آزردہ انداز میں فرماتے ہیں کہ حقیقت خرافات میں کھوگئی۔ اور امت روایات میں کھوگئی۔ یہاں پھر دین اسلام پر عجمی اثرات کو روایات کہہ کر پکارتے ہیں۔ اور عجمی تصورات کے اثرات کو خرافات کہتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کس قدر اسلامی تمدن تصوف شریعت اور کلام کو اصل اسلامی حجازی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں اور خطیب بھی دوسروں کے دلوں کو مسخر کرنے کے لیے ان عجمی روایات کے سہارے دلوں کو لبھانے والی باتیں کرتا ہے مگر اس کا کلام لذت شوق سے دور ہے۔ اس طرح خطیب اپنے کلام کو منطق اور لغت کے سہارے لے کر آگے بڑھاتا ہے۔ بے شک اس سے خطیب کے کلام کی ظاہری

صورت تو دلفریب نظر آتی ہے مگر غور کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ لغت کے سہارے اور منطق کی آڑ میں جو کچھ وہ پیش کر رہا ہے وہ سلجھایا ہوا ہے اور وہ صوفی (ماضی کی طرف اشارہ ہے) کہ محبت اور حمیت میں کوئی اس کے برابر نہ تھا۔ خدمت خلق اس صوفی کا شیوہ تھا۔ وہ بھی عجم کے خیالات میں کھو گیا اور یہ سالک (سالک سلوک کی منزلیں طے کرنے والے کو کہتے ہیں) مقامات میں کھو گیا۔ (سلوک کی کئی منازل ہیں ان کو مقامات کا نام دیا جاتا ہے) کچھ سالک کچھ مقامات پر رک جاتے ہیں جیسے سرمدلا کی منزل پر۔

تصوف شریعت اور کلام پر عجمی اثرات کی وجہ سے عام مسلمان کے دلوں کی آگ بھی بجھ گئی اور مسلمان راکھ کا ڈھیر بن چکے ہیں۔ تصوف شریعت اور کلام پر عجمی اثرات بڑا اہم موضوع ہے۔ اقبال نے چند شعروں میں بہت کچھ بتا دیا ہے۔

پیرومرید

مریدِ ہندی

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں!
ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں!

پیرِ رومی

مرغ پَر نارستہ چوں پرّاں شود
طعمۂ ہر گربۂ درّاں شود

اقبال پیر رومی سے مکتب کے نوجوانوں کے افرنگ کا قیدی یا مقلد بن جانے کا سوال کرتے ہیں۔ آج کا پڑھا لکھا یا پڑھنے لکھنے والا یورپی علوم کا مقلد بن گیا ہے اس طرح دین سے دور ہوتا جارہا ہے۔ اقبال افسوس سے کہتے ہے کہ وہ گرم خون جو مسلمان نوجوان کی رگوں میں دوڑتا تھا۔ وہ جوان فکر اور جوان سوچ اور اس کا جدوجہد اور تگ ودو سے بھرپور کردار وہ نہیں رہا جو کبھی تھا۔

پیر رومی جواب دیتے ہیں کہ جس پرندے کے پر نہ نکلے ہوں اڑے گا تو بلی کا لقمہ بن جائے گا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ امت مسلمہ کو اپنے بچوں کی تعلیم اور تربیت پختہ بنیادوں پر استوار کرنی چاہیے تب ہی وہ ذہنی طور پر دوسروں سے مرعوب نہ ہوں گے۔ ان کی چونکہ تربیت و تعلیم ٹھیک نہیں ہوئی اسی وجہ سے یہ یورپی علوم سے مرعوب ہوئے ہیں۔ نقطہ یہی ہے کہ امت

مسلمہ کی تربیت کرنے والے اداروں کی کوتاہی ہے! پہلے ان کی پوری تربیت کی جائے اور ان کی عقائد پختہ بنیاد پر استوار کیے جائیں۔ پھر کوئی خوف اس عمارت کے گرنے کا نہیں!

یہاں یہ بات یاد رہے کہ انگریزوں نے سکول کالجز میں سائنسی تعلیم کو اہمیت نہیں دی بلکہ لٹریچر میں الجھا دیا اور اس میں بھی ایسے ادیبوں اور شاعروں کو کورسز میں رکھا جو سائنسی مزاج کے برعکس جذباتی پن پیدا کرتے تھے۔ اس طرح انگریزوں نے غلام ہندوستان میں سائنسی مزاج پیدا نہیں ہونے دیا۔

تاتاری کا خواب

کہیں سجادہ و عمامہ رہزن
کہیں ترسا بچوں کی چشمِ بیباک!
ردائے دین و مِلت پارہ پارہ
قبائے ملک و دولت چاک در چاک!

مولانا مہر لکھتے ہیں۔

'سجادہ۔ جائے نماز۔ ترسا بچہ! یہ لفظ عموماً شراب فروشوں کے ملازموں کے لیے استعمال ہوتا رہا۔ جنھیں حسن و جمال میں امتیاز کی بنا پر ساقی گری کے کام پر لگایا جاتا تھا۔ کیونکہ اسلامی دور میں شراب فروشی کا پیشہ عموماً یہودیوں اور عیسائیوں سے متعلق ہوتا تھا۔ اس لیے یہ لڑکے بھی ان کے ہم قوم ہوتے تھے۔ آج کل مختلف ہوٹلوں یا تجارتی فرموں اور دکانوں میں اس غرض سے خوب صورت لڑکیاں ملازم رکھی جاتی ہیں کہ گاہک نظر بازی کے شوق میں آئیں اور تجارت فروغ پائے۔ پرانے زمانے میں شراب فروش یہ کام خوب صورت لڑکوں سے لیتے تھے۔'

تاتاری خواب میں دیکھتا ہے کہ کہیں جائے نماز اور دستار عوام کے لیے رہزن بنی ہوئی ہے یعنی علما اور صوفیا انھیں غلط راستے پر لگا رہے ہیں۔ کہیں ساقی گری کرنے والے خوب صورت لڑکوں کی بے باک نگاہیں ایمان کی دولت پر ڈاکے ڈال رہی ہیں۔ دین اور ملت کی چادر پارہ پارہ نظر آتی ہے یعنی نہ دین سلامت ہے۔ نہ ملت میں اتحاد کی کوئی صورت نظر آتی ہے۔ ملک اور سلطنت کا لباس چاک در چاک اور تار تار ہو رہا ہے۔

ان دو رہزنوں کو ملا کر اقبال نے سجادہ وعمامہ کے اپنے مقام سے پاتال میں گرنے کو واضح کیا ہے۔

ردائے ملت و دین اور متاع ملک و دولت تین راہزن لوٹ رہے ہیں۔

اہل سجادہ

اہل عمامہ

ترسا بچے

بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔

maablib.org

حال و مقام

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج
بندے کو عطا کرتے ہیں چشمِ نگراں اور
احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور
الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور!
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور!

حال اور مقام؟ اصطلائیں ہیں۔ راہ حق کا سالک سلوک کی منزلیں طے کرنے لگتا ہے تو اس کی روحانی کیفیت ہر مقام پر بدلتی رہتی ہے۔ اور اس کے سامنے سے پردے ہٹتے چلے جاتے ہیں۔

دل زندہ ہو تو ایک ترتیب سے آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں پر حقیقت عیاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کی کوئی حد نہیں۔

راہ حق کا سالک اس کا زمانہ اور مکاں بدلتا رہتا ہے۔ ایک مقام سے اوپر والے مقام پر ایک زمان سے دوسرے زمان میں پہنچ جاتا ہے۔ تیسرے شعر میں اقبال ملا اور مجاہد کے کردار کا فرق واضح کرتے ہیں اذان کے الفاظ تو وہی ہوتے ہیں مگر ملا کی اذان اور مجاہد کی اذان کی تاثیر

میں فرق ہوتا ہے۔

آخری شعر میں گدھ اور شاہیں کا فرق واضح کرتے ہیں دونوں ایک فضا میں پرواز کرتے ہیں مگر گدھ کسی اور جہاں مزاج کیفیت، سوچ فکر میں ہوتا ہے مگر شاہیں کی بلند پروازی کا مزاج مقصد کیفیت سوچ اور فکر میں ہوتا ہے دونوں میں بہت فرق ہے جس طرح ملا اور مجاہد کی اذان میں الفاظ کے ایک ہونے کے باوجود تاثیر کا فرق ہے۔ اسی طرح شاہیں اور گدھ کی ایک ہی فضا میں پرواز ہے مگر ان میں بہت فرق ہے۔ مُلا کو گدھ کے مماثل اور مجاہد کو شاہین قرار دیا ہے۔ گدھ مردار کھانے والا ہے۔

پنجاب کے پیرزادوں سے

حاضر ہوا میں شیخِ مجدّدؒ کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو
آنکھیں مری بینا ہیں، ولیکن نہیں بیدار!
آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند
ہیں اہلِ نظر کشورِ پنجاب سے بیزار!
عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خِطّہ کہ جس میں
پیدا کُلہِ فقر سے ہو طُرۂ دستار
باقی کُلہِ فقر سے تھا ولولۂ حق
طُرّوں نے چڑھایا نشۂ خدمتِ سرکار!

اقبال خاص طور پر پنجاب کے پیرزادوں سے مخاطب ہیں۔ پنجاب وہ خطہ ہے جو مسلمانوں سے سکھوں کی حکمرانی میں گیا اور پھر رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد انگریزوں نے قبضہ کرلیا۔ جنگ آزادی 1857ء میں پنجاب کے عام مسلمانوں نے شدید مزاحمت کی مگر پنجاب میں سے انگریزوں کو فوجی قوت بھی ملی۔ اقبال ایسے تو عالم اسلام سے مخاطبت کرتے ہیں اور خاص طور پر خطہ ہندوستان کے مسلمانوں سے مگر اس نظم میں تخصیصی انداز میں پنجاب کے پیرزادوں سے مخاطب ہیں۔

پنجاب کے پیرزادوں کو بتاتے ہیں کہ میں شیخ مجدد کی پرنور لحد پر حاضر ہوا۔ اس لحد کی خاک کی روشنی سے آسمان کے ستارے شرمار ہے تھے۔ کیونکہ اس خاک میں ایک صاحب اسرار پوشیدہ ہے اور وہ مرد حق بین وہ ہے جس کی گردن جہانگیر کے آگے نہ جھکی اور جس کے نفس گرم سے گرمی اصرار ہے۔ وہ ہند میں ملت اسلامیہ کی اسلامی میراث کا وارث اور نگہبان ہے خدا کی ذات نے اس کو بروقت میراث اسلام کی حفاظت سے آگاہ کیا اور اُس نے ملت اسلامیہ کے سرمایہ کی حفاظت کے لیے زندگی وقف کردی۔

مولانا مہر لکھتے ہیں:

''واضح رہے کہ اقبال اسلامیت کی حفاظت کے لیے ہندوستان کی تین بڑی شخصیتوں کے معتقد تھے۔ صوفیہ عظام میں حضرت مجدد کے سلاطین میں عالمگیر کے علما کرام میں سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے فرمایا کرتے تھے کہ یہ تین شخصیتیں پیدا نہ ہوتیں تو اسلام اپنی حقیقی صورت میں یہاں محفوظ نہ رہ سکتا۔''

اقبال کہتے ہیں کہ میں نے حضرت مجدد سے عرض کی کہ مجھے فقر کی دولت عنایت فرمایئے۔ کہ میری آنکھیں بینا ہیں لیکن نہیں بیدار۔ یہ کہ دل ونظر بیدار نہیں۔

تو لحد سے صدا آئی کہ پنجاب کے باسیوں پر فقر کا باب بند ہو چکا ہے۔ (اقبال پنجاب سیالکوٹ کے رہنے والے ہیں) اہل نظر، اہل عشق پنجاب کی سرزمین والوں سے بیزار ہیں۔ بیزار کا لفظ یہاں جس کیفیت کا اظہار کر رہا ہے اقبال ہی کا کمال ہے۔

کیونکہ پنجاب کے اہل فقر نے کُلہ فقر کو طرہ دستار میں تبدیل کر دیا ہے اس وجہ سے عارف نے اس خطہ زمین سے ٹھکانہ اٹھالیا ہے۔ اہل فقر کے کُلہ سے حق کا جوش و جذب باقی و زندہ تھا۔ مگر کُلہ کے طرہ بن جانے سے یہ ہوا کہ خدمت سرکار یعنی انگریز سرکار کی خدمت میں جُت گئے۔ یعنی پہلے اہل فقر حق کے خدمت کرنے والے تھے مگر جب ان کی قلب ماہیت ہوئی تو انگریز سرکار کی خدمت میں لگ گئے اس لیے اب عارف اس خطہ پنجاب سے بیزار ہیں! یہ اقبال ہیں جو پنجاب کے پیرزادوں کو یہ بات کہہ رہے ہیں!

وجہ یہ ہے کہ پیرزادوں نے دین حق کی پیشوائی چھوڑ کر انگریزوں کی غلامی کر لی ہے۔ اسی وجہ سے حقیقی عارف پنجاب کے پیرزادوں سے بیزار ہیں! پیرزادے، صاحبزادے بھی نواب زادوں کی طرح بادشاہوں جیسے اطوار اور عادات اپنا چکے ہیں۔ اب یہ پیرزادے خدمت خلق کے برعکس خدمت سرکار میں جُت گئے ہیں۔

فقر

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری!
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری!
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری!
اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری!
اک فقر ہے شبیری، اس فقر میں ہے میری!
میراثِ مسلمانی، سرمایۂ شبیری!

تین اشعار کی اس نظم میں اقبال فقر کی دو قسموں کا بتاتے ہیں ویسے تو فقر کی اپنی اصل حالت ایک ہی ہے۔ یاں جب اس میں عجمی عناصر شامل ہوئے یا عیاروں نے درویشی لباس پہن لیا تو دوسری قسم بھی وجود میں آ گئی۔ اقبال انھی دو قسموں کے بارے میں بتاتے ہیں۔ ایک حقیقی اسلامی فقر اور ایک فقر وہ ہے جو صیاد یعنی شکاری کو شکار بنا دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ فاعل سے مجہول بنا دیتا ہے۔ فاعل قوتوں میں پژمردگی اور خاک نشینی در آتی ہے۔

ایک فقر وہ ہے جس میں فاعل قوتیں بیدار ہوتی ہیں۔ مسلمان کے اندر دنیا کو تسخیر کرنے والی قوتیں جاگتی ہیں۔ یہ فقر مسلمان کو راکب بناتا ہے۔ جہانگیری کے اسرار و رموز سے آگاہی ملتی ہے۔

دوسرے شعر میں بتاتے ہیں کہ اک فقر قوموں کو مسکینی، پژمردگی، افسردگی اور خاک نشینی سکھاتا ہے۔

ایک فقر وہ ہے جو امام حسینؑ کے کردار میں نظر آتا ہے اور یہی وہ فقر ہے جو مسلمان کی میراث ہے اور اسی فقر سے میری بھی حاصل ہوتی ہے۔

ایک فقر مسلمانوں کو شکار، مسکین اور دلگیر بناتا ہے۔ یہ وہ فقر ہے جو عجمی اثرات میں پروان چڑھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی کتاب میں ایک باب 'اسلامی تصوف پر ہندی اثرات' لکھا جو الگ سے چھپ چکا ہے۔ اصل حجازی عربی اسلامی فقر امام حسینؑ کی ذات میں نظر آتا ہے۔ اقبال اس اسلامی حجازی عربی فقر کو مسلمانوں کے لیے مشعل راہ سمجھتے ہیں۔

maablib.org

خانقاہ

رمز و ایما اس زمانے کے لیے موزوں نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن
"قم باذن اللہ" کہہ سکتے تھے جو، رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن!

ان دو اشعار میں اقبال خانقاہ کے زوال کا ذکر کرتے ہیں۔ پہلے مصرعے میں کہتے ہیں کہ رمز و ایما اس زمانے کے لیے موزوں نہیں۔ کسی بھی زبان کی شاعری رمز و ایمائی کیفیت لیے ہوتی ہے۔ خود اقبال کی شاعری رمز و ایما تشبیہ و استعارہ و تلمیحات کا بہت بڑا ذخیرہ اپنے اندر رکھتی ہے۔ مگر اقبال نے مبین انداز میں بھی بہت کچھ کہا ہے۔ یہاں بھی کہتے ہیں کہ سخن سازی کا فن مجھے آتا بھی نہیں۔ یہ بھی شاعرانہ تعلّی ہے ورنہ اردو شاعری کی تاریخ میں میر، غالب اور اقبال کی سخن سازی اور فنی محاسن پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔

سیدھے صاف انداز میں اقبال فرماتے ہیں قم باذن اللہ کہنے والے مردہ روحوں میں زندگی دوڑا دینے والے زندگی کی حرارت، حرکت، جوش، گداز اور عشق بیدار کرنے والے رخصت ہوگئے ہیں۔

اب خانقاہوں میں مجاور اور گورکن باقی رہ گئے۔ مجاور جنھوں نے قبروں کو شکم پروری کا ذریعہ بنالیا ہے۔ گورکن پیسے لے کر قبریں کھودنے والے۔ اقبال کی سخن سازی بھی دیکھیں حالانکہ یہ ہمارا موضوع نہیں۔ پہلے مصرعے میں قم باذن اللہ اور دوسرے مصرعے میں گورکن کے الفاظ رکھ کر عرش سے پاتال میں گرنے کی پوری تاریخ سمودی ہے!

شیخِ مکتب سے

شیخِ مکتب ہے اک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روحِ انسانی
نکتۂ دل پذیر تیرے لیے
کہہ گیا ہے حکیم قاآنی
"پیشِ خورشید برمکش دیوار
خواہی ار صحنِ خانہ نورانی"

مدرسے کے استادوں کو بتاتے ہیں کہ تم ایک عمارت بنانے والے ہو اور وہ عمارت روح انسانی کو سنوارنا اور سیرت انسانی کا صحیح سانچا تیار کرنا ہے۔

تمھارے لیے قاآنی ایران کا مشہور شاعر یہ کہہ گیا ہے۔

وہ نکتہ دل پذیر یہ ہے کہ اگر تو اپنے گھر کو روشن رکھنا چاہتا ہے تو ایسی دیوار نہ بنا جو سورج کی روشنی کو تمھارے گھر میں آنے سے روک دے۔

اقبال فرماتے ہیں کہ مدرسہ والوں نے اونچی دیواریں بنالی ہیں۔ وہ دوسرے علوم کی روشنی کو روک رہے ہیں جو کہ کارلا حاصل ہے۔ علوم کی روشنی سورج کی طرح دیواروں سے نہیں رکتی۔ مراد یہ کہ تمہارے ذمے سب سے اہم اور مقدس فریضہ ہے روح انسانی کو سنوارنا اور سیرت انسانی کو بہتر کرنا...... اور تم دیواریں بنا کر دوسرے علوم سے بے بہرہ ہو رہے ہو۔ مراد یہ کہ کچھ علوم سے دور ہو رہے ہو۔ اپنے آپ کو جیسے ان علوم سے چھپا رہے ہو۔

باغی مرید

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دِیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن!
شہری ہو دہاتی ہو، مسلمان ہے سادہ
مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن!
نذرانہ نہیں، سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقہء سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن!

پہلے شعر میں اقبال ایک باغی مرید کی زبان سے کہلواتے ہیں کہ ہم کو تو مٹی کا دیا بھی میسر نہیں اور پیر صاحب کا گھر بجلی کے چراغوں سے روشن ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ مرید کو تو سائیکل بھی میسر نہیں۔ پیر صاحب پجاور مرسیڈیز میں سفر کرتے ہیں۔ مرید کو تو وہ ڈسپرین میسر نہیں۔ پیر صاحب سالانہ چیک اپ کے لیے یورپ جاتے ہیں۔

دوسرے شعر میں اقبال کہتے ہیں اس میں شہری اور دیہاتی کی تخصیص نہیں ویسے تو دیہاتی اور شہری زندگی کا فرق کیا جاتا ہے کہ شہروں کے رہنے والے دیہاتیوں سے تیز اور چالاک ہوتے ہیں۔ مگر اس معاملے میں دیہاتی اور شہری کی کوئی تفریق نہیں۔ دونوں سادہ لوح ہیں اور کعبے کے برہمنوں کو بتوں کی طرح پوجتے ہیں۔ مانند بتاں۔ کعبے کے برہمن، یعنی

پیروں نے برہمنوں کے طور طریقے اپنا لیے ہیں۔

تیسرے شعر میں نذر نیاز نذرانہ کہہ کر کہتے ہیں کہ یہ پیروں کا سود ہے۔ ہر فرقہ سالوس کے اندر مہاجن چھپا ہوا ہے۔ مہاجن سودی کاروبار کرنے والا۔

آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ مسند ارشاد جہاں کبھی عقاب یعنی اصل اہل فقر عام مسلمانوں کے دلوں کو عشق الٰہی سے منور کرتے تھے۔ اب اُن عقابوں کی جگہ کوؤں نے قبضہ کر لیا ہے۔ زاغ کہہ کر اقبال نے کیا کچھ نہیں کہہ دیا اور کیا کیا نہیں اس میں چھپا کر واضح کر دیا۔

پہلا شعر تو عام و خواص کے وردِ زبان ہے مگر اگلے شعر پیری اور مریدی کے طریقہ واردات سامنے لاتے ہیں۔ جو ایک مسلمان کے دل کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ پیری مریدی کو مہاجنوں کے کاروبار سے مماثل بنا کر مسلمانوں کی فکر کو جھنجوڑتے ہیں۔

کوے کائیں کائیں کرتے ہیں۔

قطعہ

کل اپنے مریدوں سے کہا پیرِ مغاں نے
قیمت میں یہ معنی ہے دُرناب سے دہ چند
زہر اب ہے اس قوم کے حق میں مےٗ افرنگ
جس قوم کے بچے نہیں خود دار و ہنر مند

اس قطعہ میں اقبال مےٗ افرنگ یعنی یورپی علوم وفنوں کے بارے فرماتے ہیں کہ جس قوم کے بچوں میں خودداری اور ہنرمندی نہیں اُن کے لیے یہ علوم زہر ہیں۔ بار بار اقبال امت مسلمہ کو یورپ کی چکاچوند جو شیشے کی طرح چمکدار ہے سے بچاتے ہیں کیونکہ یہ ظاہری قلعی اترنے والی اور یہ تہذیب خودکشی کرنے والی ہے۔غلط راستے پر ہے۔

اور یہ بات اقبال پیر مغاں کی زبان سے مریدوں کو وعظ کی صورت میں بتاتے ہیں کہ اس کی قیمت درِناب سے دس گنا زیادہ ہے۔یعنی یہ بات کہ پہلے اپنی خودی بیدار کرو۔ پھر ہنر مند بنو یہ کہ زمانے کی چالاکیوں اور ضرورتوں پر ماہرانہ نظر رکھو۔ پھر کوئی خوف نہیں۔

اقبال جانتے تھے کہ کئی لوگ جو اس زمانے میں یورپ گئے یورپی نظریات فکر اور فلسفہ اور تہذیب کے اسیر ہو گئے ۔اس لیے کہ اُن کے عقاید علم اور مزاج پختہ نہ تھے۔ اقبال اس لیے کہتے ہیں کہ پہلے اپنی خودی، اپنے علوم وفنون اپنی تہذیب اور اپنے دین میں پختگی حاصل کرو۔ پھر سب علوم پڑھو۔ یہاں خطاب روایتی پیر نہیں بلکہ پیر مغاں خطاب کر رہا ہے!

اجتہاد

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق!
حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں
آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق!
خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق!

ان چاروں اشعار میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا پوسٹ مارٹم کر دیا ہے۔ اقبال فرماتے ہین کہ ہند میں حکمت دین سیکھنے والے کہاں جائیں۔ دو بڑے مکتبۂ فکر و عمل تھے جہاں سے دین اسلام کے چراغ جلتے تھے۔ دونوں اب اس مرتبے سے خاک نشیں ہو گئے ہیں۔ نہ علما کے پاس گہرے افکار ہیں اور نہ ہی صوفیا کے کردار میں عشق الٰہی ہے۔ غرض کہ افکار و کردار کے دونوں مرکز دین کی حکمت سے تہی دامن ہو چکے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ افکار اور کردار دونوں باہم مربوط ہیں۔ افکار کردار کو بہتر بناتے ہیں اور کردار افکار میں بلندی پیدا کرتا ہے۔

دوسرے شعر میں اہل شوق کے جرات اندیشہ سے محروم ہو جانے کا ذکر کرتے ہیں اور اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ محکومی میں مذہبی رہنما تقلید جامد پر اتر آتے ہیں اور اُن میں حق کی

تلاش کا مادہ زوال پذیر ہو جاتا ہے۔ اُن میں تحقیق کی وہ جرات نہیں رہتی جس کو جرات اندیشہ اقبال نے کہا ہے۔ تحقیق کا مادہ ان ہی میں ہوتا ہے جو حق کے متلاشی ہوتے ہیں اور اندیشوں سے ٹکرانے کی جرأت رکھتے ہیں۔

تیسرے شعر میں فقیہانِ حرم کے بے توفیق ہونے کا ذکر ہے چونکہ یہ فقیہان حرم محکوم بھی ہیں اور محکوموں میں تقلید رچ بس جاتی ہے اس لیے وہ تحقیق سے آنکھیں چرانے لگتے ہیں۔ ان کا دل حق تک پہنچنے سے خوف کھانے لگتا ہے وہ حاکموں کے چہروں پر بل نہیں دیکھ سکتے ان کے مقلد بن جاتے ہیں اور اس درجہ پر اتر آتے ہیں کہ قرآن کریم لاریب کتاب کو تاویلات کے ذریعے بدل رہے ہیں یعنی اس کی تفہیم اپنے مزاج اور خواہشات کے مطابق کر رہے ہیں۔

آخری شعر میں اقبال فقیہان حرم کو غلام کہہ کر فرماتے ہیں کہ چونکہ قرآن کریم غلامی کے طریق نہیں سکھاتا بلکہ قرآن کریم تو کائنات کو مسخر کرنے کی تلقین فرماتا ہے۔ اس وجہ سے یہ غلام (نعوذ باللہ) خدا کی لاریب کتاب کو اپنے طور پر ناقص خیال کرتے ہیں۔

چار شعروں میں اقبال نے ہند کے علما اور فقہا کا کردار واضح کر دیا ہے۔ ظاہر ہے سب کے سب نہیں اقبال عمومی لہجے میں ذکر کرتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اکثریت علما اور فقہا کی ایسی ہو گئی ہے ورنہ آستینوں میں یدِ بیضا والے فرقہ پوش بھی ہوتے ہیں۔

مُلّائے حرم

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے، نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

پہلے شعر کے پہلے مصرعے میں ملا کے دعوئ کا ذکر ہے جو شاید ملاؐ بار بار دھراتا ہے کہ میری رسائی خدا تک ہے۔ اقبال کہتے ہیں ہم مان لیتے ہیں مگر یہ بات کھٹکتی ہے کہ تیری نگاہ سے آدمی کا مقام پوشیدہ ہے۔ اس میں در پردہ ملاؐ کے آدمیوں کو حقیر و پُر تقصیر سمجھنے کی طرف اشارہ ہے۔ پھر دوسرے شعر میں ملاؐ کے دعوئ کے برعکس عمل اور کردار واضح کرتے ہیں۔ تیری نماز میں نہ جلال نہ جمال ہے۔ خدا کے حضور دست بستہ مسلمان حاضر ہوتا ہے کہ خدا کے جلاؒل و رعب سے اس کا بدن اور اس کی روح لرزاں ہوتی ہے۔ تیری نماز میں جلال و جمال الٰہی نظر نہیں آتا کہ تیری نماز کے جمال کو دیکھ کر مسلمان نماز کی طرف راغب ہوں اور آخری مصرعے میں اقبال ملاؐ سے کہتے ہیں کہ تیری اذاں میں بھی سحر کا پیام نہیں۔ سحر زندگی کا استعارہ ہے۔ ظلمت کے ختم ہونے کا استعارہ ہے۔ زمانے کے منقلب ہونے کا استعارہ ہے۔ یہاں تمام دلالتوں کے ساتھ موجود ہے۔ ہمارا موضوع اقبال کے فنی محاسن نہیں ہے۔ اس لیے واپس آتے ہیں کہ میرا پیام حقیقت میں اذان ہے جس میں ظلمت سے نکلنے رات کے ختم ہونے صبح کے طلوع ہونے اور جلال و جمال الٰہی کے شان و شوکت سے جلوہ افروز ہونے کا ذکر ہے۔ تیری اذان صرف رسم کے طور پر ہے اس میں روح بلالی نہیں ہے۔

توحید

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علمِ کلام!
روشن اس ضو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام!
میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قُلْ ھُوَ اللّٰہُ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام!
آہ! اس راز سے واقف ہے نہ مُلّاؔ نہ فقیہہ
وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام!
قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام!

پہلے شعر میں توحید باری تعالیٰ کو زندگی کی حرارت اور قوت قرار دے کر کہتے ہیں کہ آج کل توحید علم کلام کا مسئلہ بن گیا ہے۔ یہاں علما کے علمی ونظری مباحث کا ذکر کر رہے ہیں۔ دوسرے شعر میں اقبال فرماتے ہیں کہ توحید کی روشنی سے اگر کردار اندھیروں سے نکل کر روشن کردار میں نہیں ڈھلتا تو پھر توحید مسئلہ علم کلام ہے۔ اسی وجہ سے مسلمان کی نظروں سے اپنا مقام پوشیدہ رہتا ہے۔ یہاں بھی اقبال مسلمانوں کے علم کلام کے مباحث میں الجھ کر اصل توحید سے دور ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔

تیسرے شعر میں میر سپہ یعنی مسلمانوں کے رہنما جو علما اور فقہا ہی ہیں سے کہتے ہیں کہ جو تیری سپہ ہے یعنی تیرا علم و کردار ہے اس میں قل ھواللہ کی شمشیر نہیں ہے اس شمشیر سے تری نیام خالی ہے۔ چوتھے شعر میں پھر فرماتے ہیں کہ ملا اور فقیہہ دونوں کی نظروں سے یہ راز پوشیدہ ہے کہ جب تک فکر اور عمل میں وحدت نہ ہو اس وقت تک افکار کی وحدت خام رہتی ہے کہ صرف منبر پر کھڑے ہو کر پر جوش تقریریں کرنے سے امت کی زندگی میں بہتری نہیں آ سکتی۔ جب تک علما اور فقہا اپنے عمل سے واضح نہیں کرتے تب تک یہ فکر خام ہی رہے گی۔

آخری شعر میں قوم کیا ہے قوموں کی امامت کیا ہے۔ یہ بیچارے دو رکعت کے امام کیا جانیں۔ پوری نظم میں مسلمانوں اور ان کے راہ نماؤں علما اور صوفیا کے کردار و سیرت اور افکار کی ناپختگی اور ان کو قوم اور قوم کی امامت اور اس کے تقاضوں سے نابلد قرار دیتے ہیں۔ دراصل اقبال مسلمانوں کو اور فقہا اور علما کو موجودہ پستی سے نکال کر افکار کی بلندی اور کردار و سیرت کی پختگی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ اور ملاؤں اور فقہا کو نظری مباحث میں الجھنے کے بجائے خدائے واحد کے احکامات پر پورے ایمان و ایقان کے ساتھ عمل پیرا دیکھنا چاہتے ہیں!

رسول کریم ﷺ کے نبوت کے اظہار سے پہلے کی زندگی بھی اس وقت کی آلودگیوں سے آلودہ نہ تھی۔ آپ کو اسی لیے قرآن ناطق کہا جاتا ہے کہ آپ قرآن کریم کا چلتا پھرتا نمونہ ہیں۔ اقبال علما اور فقہا کو بھی اس پاک ﷺ کے کردار پر عمل پیرا دیکھنے کے خواہش مند ہیں مگر ہمارے علما اور فقہا مباحث میں الجھے ہوئے ہیں۔ قول اور فعل کے تضاد کی طرف اشارہ ہے جو علما اور صوفیا میں پایا جاتا ہے۔ ملا اور صوفی دونوں اپنے معتقدین کو دنیا کی لذتوں سے بیزار کرتے اور خود دنیا کی لذتوں سے لطف اندواز ہوتے ہیں۔

maablib.org

جہاد

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
لیکن جنابِ شیخ کو معلوم کیا نہیں؟
مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود و بے اثر
ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر؟
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبۂ یورپ سے در گزر؟

انگریزوں کے دور میں کئی علما نے اور بعض روشن خیال لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ اب پہلا زمانہ نہیں رہا اب تلوار کا دور گذر گیا ہے اب قلم کا زمانہ ہے۔

دوسرے شعر میں اقبال شیخ کے مسجد میں اس وعظ کو بے اثر قرار دیتے ہیں اس لیے کہ مدت ہوئی مسلمان قوم کے ہاتھ سے تلوار دل سے عشق الٰہی ختم ہو چکا ہے جو ملت پہلے ہی اصل دین سے اور جہاد سے ہٹ چکی ہے اس پر یہ وعظ کیا اثر کرے گا مگر ہم جناب شیخ جس نے اپنے آپ کو کلیسا یعنی انگریزوں کے سامنے بیچ دیا ہے سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ حکم صرف مشرق کے لیے ہے۔ انگریزوں کے اصول وقت اور جگہ کے حساب سے بدلتے رہتے ہیں۔ کیا یہ بات ٹھیک ہے کہ اسلام اور اہل اسلام کا تو محاسبہ کیا جائے اور یورپ اور اہل یورپ اور پادریوں کو

کھلی چھٹی دے دی جائے۔ اقبال کے دور کے بعد سے بھی یورپ اور امریکہ کے ہاتھ سے تلوار چل رہی ہے۔ پوری دنیا میں تباہی کے ذمہ دار امریکہ اور یورپ والے ہیں۔ افریقہ، افغانستان، ایران، لیبیا، مصر، فلسطین، کشمیر غرض ساری اسلامی دنیا کو خون میں نہلا رکھا ہے۔ یہ آج بھی اُن کے لیے جائز ہے۔ اقبال امریکہ یورپ کی اس فطرت سے اور خون آشامی سے واقف تھے مگر اقبال یہاں بھی اپنے مسلمان رہبروں اور رہنماؤں کو سمجھا رہے ہیں جنہوں نے 'آج تلوار نہیں قلم کا زمانہ ہے' کا ورد شروع کر رکھا ہے۔ اقبال بتانا یہ چاہتے ہیں کہ خرابی اور بیماری ہمارے وجود میں موجود ہے۔ اس کا علاج تب ہی ہو سکتا ہے جب اپنے آپ کو ٹھیک کیا جائے گا۔ ان اشعار میں اقبال نے سیاسیات عالم کے مکروفریب اور فکری و عملی تضادات کی قلعی اتاری ہے۔ اور مسلمانوں کے اندر ایسے مسلمان موجود ہیں جو یورپ اور کلیسا کے ہم نوا ہیں اور کلیسا اور یورپ کے ایجنڈے کی تکمیل کر رہے ہیں۔

maablib.org

فقر و مُلوکیّت

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے
ضرب کاری ہے، اگر سینے میں ہے قلبِ سلیم!
اس کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بے تابی سے
تازہ ہر عہد میں ہے قصہء فرعون و کلیم!
اب ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقرِ غیور
کھا گئی روحِ فرنگی کو ہوائے زر و سیم!
عشق و مستی نے کیا ضبطِ نفس مجھ پر حرام
کہ گرہ غنچے کی کھلتی نہیں بے موجِ نسیم!

فقر میدان جنگ میں بغیر ہتھیاروں کے آتا ہے۔اگر سینے میں قلب سلیم ہے تو پھر ضرب کاری ہے۔تاریخ انسانی میں کئی بار ایسا ہوا کہ پاک باز مٹھی بھر نے بڑی بڑی طاقتور طاقتوں کو شکست دی۔

جب بھی کسی فرعون کا ظلم حد سے بڑھنے لگا تو فقر ملوکیت کے مقابلے میں کلیم کی صورت میں نمودار ہوا۔اور ظلمت کی تاریکی ختم کر دی۔روح فرنگی کی بنیاد سیم و زر ہے۔فرنگیوں کی کشور کشائی مال غنیمت کے لالچ میں ہے۔دنیا اس ظلم سے بھر چکی ہے لہٰذا اب فقر غیور کا زمانہ آنے والا ہے۔جس طرح حضرت موسیٰؑ نے فرعونیت کو شکست دی۔اب پھر فقر غیور ملوکیت کو جو فرنگیوں کے بہروپ میں ہے کو شکست دے کر دنیا پر ظلمت کی تاریکی ختم کر دے گی۔

جس طرح موج نسیم کلی کو شگفتہ کر دیتی ہے۔اسی طرح عشق و مستی کے غلبے نے بادِ نسیم کی طرح میرے ضبط نفس کو توڑ دیا کہ میں نے دل کی بات کہہ دی!

مولانا مہر لکھتے ہیں۔اگر اقبال تنہا فقر کا لفظ استعمال کرتے تو فقر سے مصلیٰ مراد لیے جانے کا اندیشہ باقی رہتا۔اقبال نے فقر غیور استعمال کیا یعنی وہ فقر جو اپنی غیرت وحمیت کی بنا پر دنیوی مال و دولت سے بے نیاز اور مستغنی ہوتا ہے۔دولت اس کے قبضے میں آ جائے تو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔یورپ کی حرص زر کا جواب اب صرف فقر غیور ہو سکتا ہے!

اہل فقر کی بھرمار ہے اس لیے بار بار اقبال ان کا ذکر کرتے ہیں اقبال فقر غیور کے متلاشی ہیں۔

maablib.org

سلطانی

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے،
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی
کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

ایسا فقر جس میں روح قرآنی نظر آتی ہے۔ایسے فقر کے ہزاروں مقام ہیں اقبال فقر میں عجمی اور غیر اسلامی عناصر کے در آنے سے بڑے نالاں ہیں ان تصورات نے روح قرآنی کو اصل صورت میں باقی نہیں رہنے دیا۔اور اس غیر محسوس انداز میں فقر اور اسلام میں داخل ہو گئے کہ ان کی نشان دہی کرنا بھی مشکل ہو گیا۔اقبال فقر میں روح قرآنی کو بے پردہ دیکھنے کے متمنی ہیں اور ایسے اہل فقر ہزاروں مقام رکھتے ہیں۔مقام اہل فقر کی اصطلاح ہے۔ہزاروں مقام سے مراد ایسے بلند مراتب میں جو ایسے اہل فقر کو نصیب ہوتے ہیں۔

دوسرے شعر میں اقبال فرماتے ہیں کہ مسلمان اور ان کے رہبر و رہنما اس لیے غلامی میں مبتلا ہو گئے کہ ان سے فقر کی حفاظت نہ ہو سکی۔یہاں بھی فقر کی اس کیفیت کی طرف اشارہ ہے جو مسکینی عاجزی اور خاک نشینی سکھاتا ہے۔سکر کی حالت کہا جاتا ہے۔اقبال صحو کی کیفیت کو اہل فقر کے لیے اکسیر سمجھتے ہیں۔پیوستن کے بجائے گسستن کی حالت کو فاعلی حالت جانتے ہیں اقبال فرماتے ہیں کہ تم اس لیے غلام ہو گئے کہ تم سے اپنے فقر کی نگہبانی نہ ہو سکی۔یہ ایسا نقطہ ہے جس کی نفسیاتی، سماجی اور دیگر پہلوؤں سے بھی تعبیر کی جا سکتی ہے۔مسلمان جب قرآن سے دور ہوئے تو فقر غیور کی نگہبانی نہ کر سکے اور غلامی میں مبتلا ہو گئے۔

صوفی سے

تری نِگاہ میں ہے معجزات کی دنیا
مری نِگاہ میں ہے حادثات کی دنیا
تخیلات کی دنیا غریب ہے، لیکن
غریب تر ہے حیات و ممات کی دنیا
عجب نہیں کہ بدل دے اسے نگاہ تری
بلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دنیا

مولنا غلام رسول مہر لکھتے ہیں اے صوفی تو معجزوں اور کرامتوں کی دنیا میں مگن ہے۔ تجھے ہر وقت یہی خیال رہتا ہے کہ عجیب و غریب کرشمے دکھائے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ تیرے معتقد بن جائیں اس کے برعکس میری نظر اس مادی دنیا پر جمی ہوئی ہے۔ جس میں دن رات نئے واقعے پیش آتے رہتے ہیں۔

فکر و خیال کی جس دنیا میں تو وقت گزارتا ہے اس کے عجیب اور نادر ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن اس سے زیادہ عجیب اور نادر دنیا وہ ہے جسے زندگی اور موت کی دنیا کہتے ہیں۔

تو تخیلات کی دنیا کو چھوڑ اور ممکنات کی دنیا کا رُخ کر۔ یہ دنیا تجھے اپنی طرف بلا رہی ہے۔ ممکن ہے تیری نگاہ اس دنیا کی حالت و کیفیت بدل ڈالے۔ مراد یہ کہ آج کل کے صوفی جن مشغلوں میں لگے ہوئے ہیں وہ بجائے خود کچھ بھی ہوں لیکن ان سے قوم ملک اور عالم نسانیت کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اقبال انہیں دعوت دیتے ہیں کہ اس پر توجہ کریں جو حادثات

اور ممکنات کی دنیا ہے۔

صوفی حیاتی اور مماتی کے مباحث میں الجھا ہوا ہے۔ ان معاملات اور مباحث کے بجائے زندگی کا سامنا کرنا چاہیے اور زندگی میں ناممکنات کو ممکن بنانا ہی اصل معجزہ ہے۔ کائنات کی وسعتیں مسلمان کے لیے مسخر کردی گئی ہیں اور وہ مسلمان کو بلا رہی ہیں مگر صوفی حیاتی ومماتی کے مباحث میں الجھا ہوا اور اپنے معجزات کے چرچا کرنے میں مگن ہے۔

maablib.org

تصوف

یہ حکمتِ ملکوتی، یہ علمِ لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سُرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
عجب نہیں کہ پریشاں ہے گفتگو میری
فروغِ صبحِ پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں 'اہل تصوف کی ملکوتی حکمت اوران کا لاہوتی علم بہت بڑی چیز ہوں گے اگر وہ ملت کی مصیبتیں دور نہیں کر سکتے اور اس کے درد کی دوا نہیں بن سکتے تو ان سے کیا حاصل؟ وہ بالکل بے حقیقت ہیں۔'

ان حضرات کے آدھی رات کے ذکر کے مراقبے اوران کا کیف وسرور اگر مسلمان کی خودی کی حفاظت نہیں کر سکتے تو سراسر بیکار ہیں۔ جو عقل چاند اور ستاروں کا شکار کھیلتی پھرتی ہے اگر وہ عشق کی چھپی ہوئی لذت کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی تو قطعاً بے سود ہے۔

اگر کوئی شخص عقل کی بنا پر محض زبان سے لا الہ کہہ بھی دے تو اس سے کچھ حاصل نہیں۔ جس کا دل اور نظر دونوں اسلامی رنگ میں رنگے ہوئے نہ ہوں اسے کوئی حیثیت اور مقام نہیں حاصل ہوسکتا۔ اگر میرے کلام میں بے ربطی، پریشانی اور انتشار ظاہر ہو رہا ہے تو اس میں تعجب

کی کوئی بات نہیں۔ اگر صبح کی روشنی میں پریشانی یعنی پھیلاؤ نہ ہوتو وہ بالکل بے کار ہے۔ اقبال نے اس شعر کے دوحصوں میں پریشانی کا لفظ دو مختلف معانی میں استعمال کیا ہے۔ پہلے مصرے میں پریشانی کے معنی ہیں بے ربطی اور دوسرے میں پھیلنا اور بکھرنا۔ روشنی کا پھیلنا اور بکھرنا اس کی خاصیت اور خصلت ہے۔ وہ اپنے کلام کو ہی قومی زندگی کے لیے صبح کی روشنی قرار دیتے ہیں۔

maablib.org

ہندی اسلام

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے مِلّت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خداداد
اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد!
مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

اقبال پہلے شعر میں افکار کی وحدت ملت کی زندگی کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں اگر وحدت ختم ہو جائے تو الہام میں بھی الحاد در آتا ہے۔

دوسرے شعر میں وحدت کی حفاظت قوت بازو سے قائم رہنے کا ذکر کرتے اور بتاتے ہیں کہ صرف عقلی دلائل اور مناظروں سے وحدت کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ نظم کا عنوان ہندی اسلام سے ہی ظاہر ہے کہ اسلام کی شکل صورت اور روح کو جس طرح ہندوستان میں بدلا گیا اس سے اقبال رنجیدہ ہیں۔

تیسرے شعر میں مرد خدا سے مخاطب ہیں کہ وہ قوت بازو جو وحدت افکار اور اسلام کے لیے لازمی ہے۔ وہ تو تجھے حاصل نہیں جب قوت نہیں ہوتی تو پھر کسی غار میں بیٹھ کر اللہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ تو

دشت تو دشت دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے

والی حالت ہوتی ہے۔

چوتھے شعر میں ہندوستان میں اسلام کی جو حالت ہو چکی ہے اس کا ذکر ہے۔ تصوف کے پردے میں اسلام کو مسکینی کا دین بنا دیا ہے غلامی کو خوب صورت بنا کر مسلمان کی انا اور خودی تباہ کرنے کی روش اپنا لی گئی ہے۔ اور ایسی ناامیدی دلوں پر چھا گئی کہ آئندہ کے لیے بھی اس حالتِ ناامیدی و مسکینی و غلامی سے نکلنے کی آرزو بھی کچل دی گئی ہے۔ کیونکہ تصوف کے پردے میں ان صورتوں کو خوب صورت بنا کر اسلامی روح میں داخل کر دیا گیا۔ اقبال ایسے اسلام کو جو مسکینی غلامی و ناامیدی میں ملفوف ہو ہندی اسلام کہتے ہیں اور ایسا اسلام ہند میں، صوفیا نے ایجاد کیا ہے۔ یہ اسلام رسول کریمؐ کے رب کا اسلام نہیں ہے۔

آخری شعر میں پھر ملا کا ذکر ہے۔ جس کو ہندوستان میں سجدے کی اجازت ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسلام آزاد ہے۔ یہ اس کی غلط فہمی ہے۔ یہ اجازت انگریزوں کی دی ہوئی ہے۔ مسلمان نے اپنے قوت بازو سے حاصل نہیں کی۔

اس نظم میں انگریزوں کے دور میں مسلمانوں کی مجموعی حالت اور خاص طور سے اہل تصوف اور ملا کی ذہنی حالت پر اقبال بڑے دکھی دل کے ساتھ آہ و نالہ بلند کرتے ہیں کہ جو تم سمجھ رہے ہو ایسے نہیں ہے۔ اسلام تو قوت طاقت عدل انصاف پر مبنی معاشرت کا حکم دیتا ہے اور ملا اور صوفی غلامی مسکینی اور ناامیدی عام کر رہے ہیں! اسلام کے اصل پیغام کی روح کے خلاف باتیں تصوف کی آڑ میں اسلام میں اسلامی بنا کر داخل کی جا رہی ہیں۔

شکست

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ اَلَست!
فقیہہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگِ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مَردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست!

غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

''ہمارے عہد کے صوفیوں میں وہ گرمی اور حرارت باقی نہ رہی جس کی برکت سے وہ ہر لحظہ میدان حق کے مجاہد بنے رہتے تھے۔ اب وہ زبان سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے الست کی شراب پی رکھی ہے۔ یعنی خدا کی ہستی کے اس اقرار کی مستی میں گم ہیں جو ہم نے ازل سے کیا تھا۔ دراصل یہ بے عملی کا ایک بہانہ ہے۔ ان میں حق کے لیے ایثار و قربانی کی ہمت نہیں رہی۔ وہ ہاتھ پاؤں توڑ بیٹھے۔ ظاہر یہ کررہے ہیں کہ وہ خدا کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ عالموں کی حالت ملاحظہ ہو۔ انھیں جب نظر آیا کہ شریعت کے احکام صاف صاف بتانے میں خطرات ہیں اور حاکموں سے لڑائی مول لیے بغیر چارہ نہیں تو انھوں نے بھی دنیا سے الگ تھلگ رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے سوا انھیں کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ اس لیے کہ حاکموں کا مقابلہ کرتے تو انھیں گوناگوں تکلیفیں پیش آتیں۔

غرض یہ بہادر جو زندگی کی کھینچ تان میں سب سے آگے رہنے والے تھے۔ گھبرا کر میدان سے بھاگ نکلے۔ اب سوچیے کہ اس گریز کو شکست قرار نہ دیا جائے تو شکست اور ہے کیا چیز؟

غرض نہ صوفی میں مجاہدانہ حرارت ہے اور نہ ہی اہل شریعت میں حق بات کرنے کا حوصلہ ہے۔ صوفی تو پہلے ہی زندگی سے الگ ہو چکا تھا۔ اب اہل شریعت نے بھی دین اور دنیا، حکومت اور دین جیسی تفریق پیدا کر کے اپنے آپ کو صوفیا کی طرح زندگی کی تگ و دو اور جدوجہد سے الگ کر لیا ہے۔ زندگی سے یہ گریز دراصل شکست تسلیم کرنا ہی ہے!

جب شکست تسلیم کر لی جاتی ہے تو پھر انا، عزت، وقار، خودی ختم ہو جاتی ہے۔ جدوجہد تگ و دو حرکت و حرارت کی آگ بجھ جاتی ہے۔ برصغیر کے صوفی و مُلّا نے زندگی سے کنارہ کش ہونے کے لیے تصوف اور الست بربکم میں پناہ ڈھونڈ لی۔

maablib.org

مستیٔ کردار

صوفی کی طریقت میں فقط مستیِ احوال
مُلاّ کی شریعت میں فقط مستیِ گفتار
شاعر کی نَوا مردہ وا فسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست، نہ خوابیدہ نہ بیدار!
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ پے میں فقط مستیٔ کردار!

کسی بھی قوم کی تباہی امیروں اور رہنماؤں کی کم نظری یا شکم پروری کی وجہ سے ہوتی ہے۔اقبال بھی امت مسلمہ کی بدحالی وناتوانی کا سبب بھی ملا اور صوفی اور زاہد کو سمجھتے ہیں کیونکہ عام مسلمان پران کے اثرات پڑتے ہیں۔

اس نظم میں اقبال اہل طریقت اور اہل شریعت کے ساتھ ساتھ شعرا کا بھی ذکر کرتے ہیں۔اپنے زمانے کے شاعروں کی نوا کو بھی مردہ اور افسردہ اور بے ذوق کہتے ہیں۔ان شاعروں کے افکار بھی اہل طریقت اور اہل شریعت کی طرح اپنے آپ میں غرق ہیں نہ یہ سوئے ہوئے ہیں اور نہ جاگ رہے ہیں غرض نیم خوابیدہ ہیں۔اس کیفیت میں انسانی دماغ اور فکر پوری طرح کام نہیں کرتا۔اقبال شاعروں کو بھی مدہوش اور افسردگی پھیلانے والے قرار دیتے ہیں۔آخری شعر میں اقبال تاسف سے کہتے ہیں کہ وہ مرد مجاہد مجھے نظر نہیں آتے ہیں جن میں کردار کی مستی ہو۔

اہل طریقت، اہل شریعت اور شعرا سب کے سب مایوسی افسردگی پھیلانے والے اور کردار سے عمل سے عاری ہیں اور با کردار باعمل مجاہد جس میں زندگی کی حرارت ہو نظر نہیں آتا!
صوفی اپنے بنائے ہوئے حلقے میں مست ہے۔ ملا منبر پر جوش وخروش سے خطابت کی مستی میں مست ہے۔ اقبال ایسے مرد مجاہد کی راہ دیکھ رہے ہیں جو مستی کردار کا حامل ہو۔ اقبال کے مجاہد سے مختلف مجاہدین کے گروہوں کی طرف دھیان نہیں جانا چاہیے۔ اگر آج اقبال ہوتے تو صوفی اور مُلا کی طرح مجاہدین حق اور خود ساختہ مجاہدین کے کردار کو بھی واضح کرتے۔

مہدیٔ برحق

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیار
پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں
نَے جدتِ گفتار ہے، نے جدتِ کردار

مشرق والے ہوں یا مغرب والے سب کے سب اپنے بنائے ہوئے قید خانوں میں قید ہیں۔

پیران کلیسا ہوں یا شیخان حرم دونوں میں نہ جدت گفتار ہے اور نہ ہی جدت کردار ہے۔ اقبال دینی راہنماؤں کی کم مائیگی کا رونا روتے ہیں تو پیران کلیسا کا ذکر اس لیے کرتے ہیں کہ عیسائیت کی پوری تاریخ ہمارے سامنے آ جائے۔ اور ہم کو بخوبی پتہ چل جائے کہ عیسائیت کو کس طرح ان کے پادریوں اور راہبروں نے اپنے جال میں قید کر لیا تھا۔ کس طرح انھوں نے اپنی مرضی سے اپنے مذہب کی ناک موڑی تھی۔ اب شیخان حرم بھی اس راستے پر چل رہے ہیں۔ دونوں کی گفتار اور کردار میں یبوسیت ہے۔ اور ان کے کردار میں مجہولیت طاری ہے۔ جب افکار میں رعنائی ہو گی تو کردار میں نکھار آئے گا۔

سنگ وخشت سے جہاں نہیں پیدا ہوتے۔ افکار تازہ سے جہاں تازہ کی نمود ہوتی ہے۔ اقبال افسردہ ہیں کہ شیخان حرم اور پیران کلیسا ان سے محروم ہیں!

جدت گفتار اور حدت کردار زندگی میں رنگارنگی اور ہمہ ہمی کی علامت ہے مگر یہ تب پیدا ہوتی ہے جب افکار میں جدت آتی ہے اور افکار میں جدت عمیق مطالعے اور گہرے تجزیے کے بعد آتی ہے۔ کہنہ روایات کو چھوڑنے اور آئین نو سے تصورات میں نیرنگی اور جدت آتی ہے اور پھر ہی قومیں ترقی کی طرف سفر شروع کرتی ہیں۔ اقبال رنجیدہ ہیں کہ شیخان حرم کے خیالات میں کہنگی اور یبوسیت ہے۔ مہدی برحق تو وہ ہوگا جو حاضر و موجود سے بیزار ہوگا۔

maablib.org

امامت

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے
دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے
فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا . پرستار کرے!

تو نے مجھ سے امامت کی حقیقت پوچھی ہے اللہ سے دعا ہے کہ تجھے میری طرح اسرار کو جاننے سمجھنے والا بنا دے تا کہ تجھ پر یہ روشن ہو جائے کہ امامت کی حقیقت کیا ہے۔

اور باتوں کے علاوہ آخری شعر میں اس سے آگاہ کرتے ہیں کہ ایسی امامت یا ایسے امام جو مسلمانوں کو بادشاہوں کی اطاعت کرنے والا بنائے تو ایسا امام اور ایسی امامت ملت بیضا کے لیے فتنہ اور نقصان کا سبب بنتی ہے۔ اقبال کی مراد یہ ہے کہ ایسے مذہبی رہنما اور عالم جو حکمرانوں بادشاہوں کے در پر حاضری دینے والے ہیں۔ وہ اصل میں امام نہیں بلکہ امام کے روپ میں امت مسلمہ کو فتنہ و فساد میں مبتلا کرنے والے ہیں۔ ورنہ تو امام حکمرانوں کی طرف سے دعوت ملنے کے باوجود عہدوں سے انکار کرتے رہے ہیں۔ اب جو عہدوں اور شکم پروری کے لیے حکمرانوں کے پرستار بن گئے ہیں۔ وہ اصل اماموں کے جانشین نہیں بلکہ شکم پرور اور باعث فتنہ ہیں!

امام تو وہ ہے جو احساس زیاں دلا کر لہو گرما دے اور فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کر دے۔ یہاں تلوار سے اشارہ ہے میدان کارزار میں اترنے کا۔ نہ کہ سلطانوں کے در پر حاضر ہونا اور ان سے تعلقات بنانا۔ یہاں پھر فقر کی حقیقت اور اصل صورت واضح کر دی ہے کہ فقر مقابلے کی جرأت عطا کرتا ہے نہ کہ سلطانوں کا پرستار بناتا ہے۔

maablib.org

فقر و راہبی

کچھ اور چیز ہے شاید تیری مسلمانی
تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی
سکوں پرستیٔ راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
پسند روح و بدن کی ہے وا نمود اس کو
کہ ہے نہایتِ مومن خودی کی عریانی!
وجود صَیرفیٔ کائنات ہے اس کا
اسے خبر ہے یہ باقی ہے اور وہ فانی
اسی سے پوچھ کہ پیشِ نگاہ ہے جو کچھ
جہاں ہے یا کہ فقط رنگ و بو کی طغیانی!
یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی!

اسی چھوٹی سی نظم میں اقبال نے فقر کی شان دِکھا کر اس کو راہبی سے الگ کر کے ان کے درمیان جو بُعد ہے اس کو واضح کر دیا ہے۔

پہلے شعر میں ایسا مسلمان جو فقر اور رہبانی کو ایک سمجھتا ہے اس کو کہا ہے کہ تیری مسلمانی

شاید کچھ اور چیز ہے۔اصل مسلمانی نہیں ہے۔

دوسرے شعر میں بتاتے ہیں کہ فقر کی شان جدوجہد مسلسل کوشش تگ و دو اور ہمیشہ طوفانوں سے ٹکرتے رہنا ہے۔فقر راہبوں جیسی سکون پرتی سے تنفر ہے۔

تیسرے شعر میں ایک اور شان فقر کی بتاتے ہیں کہ فقر روح اور بدن دونوں کی نمود کو پسند کرتا ہے۔اس لیے دنیاوی جاہ و جال اور روحانی بلندی افکار دونوں کو درخشاں دیکھنا فقر کی شان ہے۔فقر کہ مومن کی خودی کو عریاں کرتا ہے۔ایک خوددار و خودآشنا مومن ہی شان کئی کے لائق ہوتا ہے۔

اہل فقر تو دنیا کو کھوٹے اور کھرے کی پہچان کرنے اور کروانے والے ہیں۔ان کو معلوم ہے کیا چیز فانی ہے اور کس کو بقا ہے۔اقبال انسانی خودی کی فنا کے قائل نہیں ہیں۔

اہل فقر خوب جانتے ہیں کہ رنگ کیا ہے اور بو کا مقام کیا ہے نہ رنگ اُن کی آنکھوں کو خیرہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی تیز بو ان کے احساس میں کجی پیدا کر سکتی ہے۔فقر رنگ و بو میں کھو نہیں جاتا بلکہ ان میں سے فنا ہونے والی اشیا اور بقا کی حامل چیزوں کو پہچان لیتا ہے۔

اور جب سے مسلمانوں کے اندر سے یہ فقر ختم ہو گیا ہے۔یہاں اقبال کھو دیا کہتے ہیں۔اس وقت سے مسلمانوں کے اندر سے مسلمانی چھن گئی ہے۔حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت سلیمانؑ کی طرف اشارہ ہے۔فقر کی شان دنیا کی بادشاہی بھی ہے۔بدن اور روح دونوں کی آبیاری فقر کرتا ہے۔

فقر مسلمان کے اندر جاہ وجلال و جمال پیدا کرتا ہے۔جب سے یہ فقر نہیں تو مسلمان بھی...!

غزل

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور، فقر ہو جس کا غیور!

غزل کے اس شعر میں بھی اقبال وہی بات دہراتے ہیں کہ ایسی قومیں جن کا عشق اور فقر باغیور ہوتا ہے ایسی قومیں جہاں میں خوار و زبوں نہیں ہوتیں۔ جب فقر باغیور نہیں رہتا۔ تو ایسی قوم میں خواری در آئی ہے پھر یہ خواری فکر و نظر و عمل و کردار سب پر اثر انداز ہوتی ہے اور پوری کی پوری قوم خوار و زبوں ہو جاتی ہے بات پھر اہل فقر پر آتی ہے کہ جب تک اہل فقر غیور ہوتے ہیں قوم بلند ہوتی ہے جب اہل فقر غیور نہیں رہتے تو پھر پہلے اہل فقر حقیقت میں خوار و زبوں ہوتے ہیں اور پھر قوم کی قوم خوار ہونے لگتی ہے۔

یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اہل فقر کے کردار کے اثرات عام مسلمانوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جب کوئی کجی کمی یا لالچ ہوس اہل فقر میں در آتا ہے تو پوری کی پوری قوم میں یہ بیماریاں در آتی ہیں جب اہل فقر باغیور ہوتے ہیں تو پوری قوم غیور ہوتی ہے۔

نکتۂ توحید

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے
وہ رمز شوق کہ پوشیدہ لا الہ میں ہے
طریق شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیے!
مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے
روشِ کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہیے!

نکتہ توحید بیان تو کیا جا سکتا ہے۔ مگر تمھارا دماغ بتوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہو تو کیا کیا جا سکتا ہے۔ صرف پتھر ہی کے بت نہیں بلکہ خواہشوں آرزوں اور شکم پروری اور دنیاوی فائدے جیسے ہزاروں بتوں نے مسلمانوں کو گھیر لیا ہے۔

خدائے واحد کا اقرار اور بہت سارے خداؤں کے انکار ہی میں عشق اور شوق میں پوشیدہ ہیں مگر تیرا طریق شیخ اور فقہا کی طرح ہے تو کیا کیا جا سکتا ہے۔

وہی بات کہ ایک سجدہ ہزاروں سجدوں سے نجات دیتا ہے۔ لا اور الا میں ہی ساری بات ظاہر بھی ہے اور پوشیدہ بھی ہے۔ اس کے لیے کسی تاویل اور استدلال کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس میں زاہدوں اور فقہا کے طریق کو اقبال ناپسند فرما رہے ہیں کہ لمبی لمبی تقریروں اور تاویلوں سے توحید کو سمجھا جائے۔ توحید کی حقیقت تو دو لفظوں میں پوشیدہ بھی ہے ظاہر بھی ہے۔

فقر کا مقام تو شاہی سے بلند ہے مگر اگر کسی کا مزاج ہی گدائی میں پختہ ہو چکا ہو تو کیا کیا جا سکتا ہے۔

اسی نظم میں اقبال گدایانہ روش مزاج اور شیخ وفقیہہ کے طریقوں سے آگے گذر جانے کا درس دیتے ہیں اور وہ منزل خدائے واحد کا اقرار اور دوسرے بتوں سے انکار ہی سے حاصل ہو سکتی ہے! جو شیخ اور فقیہہ گدایانہ روشن رکھتے ہیں اور بادشاہوں کے درباری بنے ہوئے ہیں انہیں علم نہیں کہ بادشاہوں سے سلطانوں سے بلند تر مقام ہے اہل فقر کا۔ اہل فقر کی نظر میں یہ بادشاہی یہ سلطنت ایک پرکاہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

الفقر وفخری

کیا کیا مقامات بلند ہوں گے کہ رسول ﷺ خدا فقر پر فخر کر رہے ہیں۔

maablib.org

اے پیرِ حرم

اے پیرِ حرم! رسم و رہ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

پیرحرم سے مراد مسلمانوں کے رہبر صوفی اور مُلاّ مراد ہیں۔رسم ورہ خانقاہی چھوڑ دو۔ اقبال نے بدل بدل کر ہزار رنگ سے اور ہزار بار ان سے بچنے کی تلقین کی ہے۔اقبال مسلمانوں کو موجودہ بدترین بیماریوں سے بچانا چاہتے ہیں جس طرح ایک ہمدرد معالج مریض کو پرہیز کی تلقین کرتا ہے۔کچھ چیزوں کے کھانے پینے سے منع کرتا ہے اور کچھ چیزوں کے کھانے پینے کا کہتا ہے۔اسی طرح اقبال بھی مسلمانوں اور ان کے رہبروں کو لاحق بیماریوں جو روحانی ہیں سے بچانے کے لیے کچھ چیزوں سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔اس شعر میں بھی صوفی اور مُلا دونوں کو خانقاہوں کے رسموں رواجوں کو چھوڑنے کا فرماتے ہیں۔

دوسرے مصرعے میں اقبال ندائے سحری کے مقصد کو سمجھنے کا کہتے ہیں۔اقبال بار بار ان خانقاہی رسموں کو جو چھوڑنے کا فرماتے ہیں تو ساتھ ہی یہ سمجھا رہے ہیں کہ میری نوا کا مقصد سمجھو کروہ کیا ہے۔

جب خانقاہوں میں مجاور اور گورکن حاوی ہو گئے تو ان نے اس روحانی ادارے کو تباہ کر دیا۔اپنی گدی کو مضبوط اور مشہور کرنے کے لیے کئی رسمیں ایجاد کر ڈالیں۔اس طرح وہ مقصد حقیقی سے دور ہوتے گئے۔اقبال ان کو حقیقی مقصد کی طرف لانا چاہتے ہیں۔یہی اقبال کی نواؤں کا مقصود ہے!

پنجابی مسلمان

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت
کرلے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا
ہو کھیل مریدی کا تو ہَرتا ہے بہت جلد!
تاویل کا پھندا کوئی صیّاد لگا دے
یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد!

اس نظم میں اقبال نے پنجابی مسلمان کی اکثریت کے مذہبی رجحان کا تجزیہ کیا ہے۔ مذہب میں نئی نئی اختراعیں اسے پسند آتی ہیں۔اور پھران سے جی بھرتا ہےتو اور اختراع کرتا ہے۔

حق کی تلاش کی جستجو میں شریک نہیں ہوتا۔مگر پیری مریدی کا کھیل ہوتو بہت جلد اس میں سب کچھ ہار جاتا ہے۔اسی شعر میں اقبال نے عام پنجابی مسلمانوں کی نفسیات کا تجزیہ پیش کردیا ہے۔پہلے مصرعے میں تحقیق کا لفظ جس کا مصدر حق ہے۔اور دوسرے مصرعے میں کھیل مریدی کے لفظوں نے بات کو اتنا واضح اور روشن اور عیاں کر دیا ہے کہ رمز رمز نہیں رہتی۔پیری مریدی ایک کھیل ہےاور اس میں مرید ہی ہارتا ہےاور کیا کچھ مرید ہارتا ہے یہ بھی کوئی چھپی ہوئی بات نہیں۔

آخری شعر میں تاویل کا پھندا اور صیاد کے الفاظ دراصل پوسٹ مارٹم رپورٹ ہے۔

تاویل تفصیل اور تفسیر کے صفتوں میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ لفظی معنی بات کو ظاہر سے پھیر دینا۔ اصطلاحی معنوں میں کم یا زیادہ مناسبت سے لحاظ سے کسی لفظ یا فقرے کو اور ہی معنی پہنا دینا۔ بعض اوقات تاویل تحریف کی حدوں سے جاملتی ہے۔ تیسرے شعر میں صیاد جب تاویل کا پھندا لگاتا ہے تو یہ یعنی مرید عام مسلمان پرندے کی طرح سے اڑ کر دانہ چگنے آتا ہے اور گرفتار ہو جاتا ہے۔ اقبال سادہ مسلمان کی کس کس بیماری کی نشان دہی نہیں کر رہے!

کھیل مریدی کا ہرتا ہے بہت جلد۔ تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے۔ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک جہان ان تراکیب میں موجود ہے۔ پیر کو صیاد کہہ کر اقبال نے پیری مریدی کی حقیقت بیان کر دی ہے۔

آزادی

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹو کے
حریت افکار کی نعمت ہے خدا داد
چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدۂ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد!
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد!
ہے مملکت ہند میں اک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد!

انگریزوں کی ہندوستان پر حکمرانی طرح طرح کے تفرقے لائی۔جن میں ایک آزادی اظہار بھی تھا حالانکہ انگریزوں نے اپنے ظلموں کے خلاف ہر اٹھنے والی آواز دبائے رکھی مگر یہاں کے مسلمانوں میں اس آزادی نے اور ہی رنگ میں اپنے رنگ دکھائے۔اسی طرف اقبال اس نظم میں اشارہ کرتے ہیں۔مسلمانوں نے ظاہر ہے یہاں مراد مسلمانوں کے مذہبی رہبر مراد ہیں۔اُن نے قرآنی تعلیمات سے تاویلات کے ذریعے نئی نئی اپنے اپنے مطلب کی شریعت بھی اختراع کرلی۔کسی نے کعبے میں آتش کدہ پارس بنالیا اور کسی نے فرنگیوں کے بت کعبے میں آباد کرلیے۔اقبال کی مراد یہ ہے کہ کسی نے اسلام میں ایرانی فکر کو شامل کرلیا اور کسی نے اسلام میں فرنگی یعنی عیسائیت داخل کرلی۔اس طرح آزادی کا استعمال مسلمانوں کے اتحاد

کو پارہ پارہ کرنے لگا۔اور ظاہر ہے کہ یہ سب اہل طریقت اور اہل شریعت ہی نے کیا کیونکہ عام مسلمان کوتو یہ ہمت نہیں اور نہ ہی مقام اور مرتبہ اور علم حاصل ہے کہ وہ تاویلات کے ذریعے یہ سب کرے۔ ہندوستان میں یہ بھی عجیب تماشا ہے کہ مسلمان تو آزاد ہے مگر اسلام قید ہے اور قیدی کے ساتھ صیاد جو چاہے وہ کرتا ہے!

اقبال یہاں بھی رہبروں کی کج فہمی جو کسی منفعت کے لیے ہے کا اظہار فرمارہے ہیں۔

اسلام محبوس ہے اور مسلمان آزاد ہے۔ مسلمانوں کی آزادی صرف اور صرف اسلام کی تاویلات کرنے، نئی نئی شریعت ایجاد کرنے تک محدود ہے۔کوئی بات ہندوستان کے حکمرانوں کے خلاف نہیں کہی جا سکتی۔ اس طرح ایک غلام قوم نے کس طرح اپنے دین کی شکل بگاڑی اقبال نے کئی انداز میں اس کو بیان کیا ہے۔

حکومت

ہے مریدوں کو تو حق بات گوارا لیکن
شیخ و ملا کو بری لگتی ہے درویش کی بات
قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاعِ کردار
بحث میں آتا ہے جب فلسفہء ذات و صفات!
گرچہ اس دیرِ کہن کا ہے یہ دستورِ قدیم
کہ نہیں میکدہ و ساقی و مینا کو ثبات!
قسمتِ بادہ مگر حق ہے اسی ملت کا!
انگبیں جس کے جوانوں کو ہے تلخاب حیات!

پہلے شعر میں اقبال فرماتے ہیں کہ میں درویش جو باتیں کرتا ہوں وہ باتیں ہوتی تو سچ حق ہیں اسی وجہ سے مریدوں کو اچھی لگتی ہیں اور اسی وجہ سے شیخ وملا کو بری لگتی ہیں۔ اس شعر میں بھی مرید تو اقبال کی مبنی برحق باتوں کو برداشت کر لیتے ہیں مگر شیخ وملاّ کو یہ مبنی برحق باتیں بری لگتی ہیں۔ظاہر ہے شیخ وملا کو جن وجوہ کی بنا پر یہ حق باتیں بری لگتی ہیں اُن پر وضاحت بھی اقبال کئی بار فرما چکے ہیں۔

دوسرے شعر میں اقبال فکر اور عمل کا ذکر کرتے ہیں اور تاریخ عالم کا نچوڑ سامنے لاتے ہیں۔جب کوئی قوم فکری مباحث میں الجھتی ہے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی فکر میں کجی آ چکی ہے۔ یاد رہے کہ فکری بلندی اور چیز ہے اور مباحث میں الجھ جانا اور بات ہے۔جب شیخ وملاّ بال کی کھال اتارنے اور موشگافیوں یعنی بال میں شگاف ڈالنے میں مشغول ہو جاتے ہیں تو سمجھ لیں

کہ قوم عمل سے عاری ہو چکی ہے اور اس قوم سے تخلیقی قوت چھن چکی ہے۔ عمل سے عاری اقوام اور انفرادی طور پر افراد مباحث میں الجھے رہتے ہیں۔ اقبال نے ملت مسلمہ کی تاریخ کے حوالے سے واضح کیا کہ جب شیخ وملاّ خدائے واحد کی ذات اور صفات کے فلسفہ میں الجھ گئے تو عمل سے محروم ہوتے گئے۔ (یا پھر فکر عمل سے محروم ہوتے ہی مباحث میں الجھتے گئے بہر حال یہ عمل اکٹھے ہی ہوتا ہے) اقبال فرماتے ہیں کہ امت مسلمہ بھی کردار کی دولت بے بہا سے تہی دست ہو چکی ہے۔ کیونکہ یہ بحثوں میں الجھی ہوئی ہے۔ بغداد کی ہلاکو کے ہاتھوں تباہی بربادی کے وقت بھی شیخ وملا انھی مباحث میں الجھے ہوئے تھے۔ تیسرے شعر میں وقت کے پہیے کے چلتے رہنے کا ذکر کرتے ہیں کہ اس زمانے کا چلن یہی ہے کہ کسی چیز کو ثبات ودوام نہیں ہے۔

آخری شعر میں پھر عمل کی قوت کا ذکر فرماتے ہیں کہ جس ملت کے جوان زندگی کی مشکلوں، تکلیفوں کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرتے ہیں زمانے کی تلخیوں کو شہد سمجھ کر پی لیتے ہیں وہی شراب کے حق دار ہوتے ہیں۔ مراد یہ کہ تگ ودو کے بعد ہی کچھ حاصل ہوتا ہے۔ تمہارے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے کوشش کرتے ہو۔ اقبال کا فرمان یہ ہے کہ جس ملت کے جوان حرکت عمل جد وجہد اور تخلیق اور عمل کے عادی ہوتے ہیں اور بے ثمر مباحثوں میں نہیں الجھتے وہی دنیا پر حکمرانی کرتے ہیں وہی باعزت ہوتے ہیں۔ میری یہ باتیں شیخ وملا کو بری لگتی ہیں کیونکہ اُن کا تو کام ہی مباحث میں عام مسلمان کو الجھائے رکھتا ہے تا کہ ان کا کام چلتا رہے۔

تربیت

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشاد دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

یہاں اقبال نے شیخ مکتب کہہ کر تعلیمی طریق کا ذکر کیا ہے اور وہ طریق جو روایتی انداز میں مکتبوں میں پڑھانے کا رائج ہے۔ جس میں ترتیب دیے ہوئے کورسز یا نظام کی طرف اشارہ ہے۔ یہ ایسے ترتیب دیے ہوئے درس ہیں جن سے دلوں کے اندر کشادگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ کشادگی یہاں روشنی کے معنوں میں لایا گیا ہے۔ اور دوسرے مصرعے میں کبریت یعنی گندھک اور بجلی کا چراغ سے بات اور واضح ہو جاتی ہے۔ اقبال نے رمز و کنایہ سے بھی کام لیا ہے مگر عموماً جب انھوں نے امت مسلمہ کا یا اس کو لاحق بیماریوں کا ذکر کیا ہے تو ایک حکیم کی طرح بیماری کو صاف اور واضح اور روشن کیا ہے اور پھر علاج بھی بتایا ہے تو صاف اور واضح لفظوں میں اور پرہیز بھی بتایا ہے تو واضح اور صاف صاف۔ کیونکہ انھیں مریض یعنی ملت اسلامیہ کی صحت یابی کی شدید ترین خواہش ہے۔ اقبال جلد از جلد ملت اسلامیہ کو مکمل صحت یاب دیکھنا چاہتے ہیں۔

یہاں بھی اقبال شیخ مکتب سے فرما رہے ہیں کہ تم گندھک سے بجلی کا چراغ روشن کرنے کی کوشش کر رہے ہو یہ کس طرح روشن ہوگا۔ جو ذہنی اور فکری بُعد ہے جس کو شیخ مکتب نہیں سمجھ سکا۔ اقبال اس کو سمجھا رہے ہیں کہ اپنی فکر اور طرز عمل میں تبدیلی نہ لاؤ گے تو دل میں روشنی نہ ہوگی!

گندھک سے روشنی اور بجلی کے چراغ سے اقبال نے سائنسی ایجادات اور پرانے انداز کا بھی موازنہ کر دیا ہے کہ شیخ پرانی فکر سے تازہ فکر کو ملانا چاہتے ہیں جو کہ ناممکن ہے۔ پہلے طریقے بدلو پھر دل میں کشاد پیدا ہوگی۔ جب نوجوانوں کی تعلیمی تربیت ہی فرسودہ طریقوں پر ہوگی تو وہ کس طرح ایجادات کرسکیں گے۔

مرگِ خودی

خودی کی موت سے پیرِ حرم ہوا مجبور
کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام

پیر حرم کا اقبال کئی جگہ ذکر کرتے ہیں اس سے اقبال صوفی و ملا دونوں مراد لیتے ہیں۔ ویسے تو پیر حرم مسلمانوں کو دین کی راہ بتلانے والے اور چلانے والے ہیں مگر جب خودی سے عاری ہو جاتے ہیں تو اُن کے کردار میں بھی فرق آ جاتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی رہبری و رہنمائی کے برعکس شکم پروری پر اتر آتے ہیں اور اپنے مقام و مرتبے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو شکم کا بندہ بنا لیتے ہیں۔ جامعہ احرام کی حفاظت پر مامور پیر حرم اس کو بیچنے لگا ہے۔ اپنی مذہبی حیثیت کو شکم پروری کا وسیلہ بنا لیا ہے۔ یہ اس وقت ہوا جب پیر حرم میں خودی و خودداری مر گئی۔ جب خودی مر گئی تو پیر حرم مر گیا۔ روحانی اور اخلاقی موت ہو گئی۔ اس روحانی موت کے بعد دین کو بیچنے لگا۔ اقبال اس دوکان داری کو مسلمانوں کی تباہی کا سبب سمجھتے ہیں۔

مہمانِ عزیز

پُر ہے افکار سے ان مدرسہ والوں کا ضمیر
خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز
چاہیے خانۂ دل کی کوئی منزل خالی
شاید آ جائے کہیں سے کوئی مہمانِ عزیز

اقبال ان دونوں اشعار میں بھی اہل مدرسہ ومکتب کا ذکر کرتے ہیں ان کے معیار اور مقدار کا ذکر بھی کرتے ہیں اور انھیں تھوڑا جھنجوڑتے بھی ہیں کہ تم نے اپنے دل کو ایرے غیرے ہر قسم کے افکار سے بھر لیا ہے۔ تمھارے دل میں افکار کی بھیڑ، یعنی مقدار کافی ہے۔ مگر معیار کی طرف تم اہل مدرسہ ومکتب کا دھیان نہیں ہے۔ خوب و ناخوب کی تقسیم تم نے اٹھا دی ہے۔ اقبال نے اچھے اور بُرے کے بجائے خوب و ناخوب کے الفاظ لا کر اہل مدرسہ کو ناخوب سے ملا دینے اور خوب کو تلاش کرنے اور اس کا انتظار کرنے کا کہا ہے۔ مہمان عزیز سے مراد خوب صورت افکار ہیں۔ اہل مدرسہ ومکتب نے رطب و یابس سے اپنے دل کو بھر لیا ہے۔

ان دو شعروں میں اقبال نے اہل مدرسہ ومکتب کو لاحق امراض کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔ کہ یہ مقدار پر مرمٹے ہیں۔ معیار کی طرف ان کا دھیان نہیں ہے۔ کس کو تمیز کی ترکیب لا کر اقبال دراصل یہ کہتا ہے کہ تمہیں تمیز نہیں ہے۔ اقبال کا فنی تجزیہ ہمارا موضوع نہیں اور ہمارے اندر طاقت بھی نہیں ورنہ پر ہے افکار اور ضمیر، خوب و ناخوب، کس کو تمیز، خانہ دل، منزل خالی اور مہمان عزیز۔ کس طرح ایک دوسرے سے دلالتیں ملتی اور پھیلتی چلی جاتی ہیں۔

مدرسہ

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو!
خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

اہل مدرسہ ایک لگی بندھی تعلیم دیتے ہیں۔ زندگی کی حقیقتوں رمزوں اور تلخیوں سے آگاہ نہیں کرتے۔ لگے بندھے کورسز اور میکانکی طرز تعلیم۔ خاص سوچ سے ترتیب دیے ہوئے نصاب طالب علموں کو ذہنی کشادگی عطا نہیں کرتے بلکہ طالب علموں کے ذہنوں کو خاص سانچوں میں ڈھال دیتے ہیں۔ ایسے اسرار جو زندگی کی حقیقتوں سے آشنا کرتے ہیں وہ کوہ و بیاباں میں عیاں نظر آتے ہیں مگر مدرسہ والے طالب علموں کے ذہنوں پر واضح نہیں کرتے کہ خود آگاہ نہیں۔

یا بندہ صحرائی یا مردِ کہستانی

اقبال کی اس ترکیب پر بھی دانشوروں نے بڑی لے دے کی ہے کہ اقبال غیر مہذب انسانوں کو تبدیلی کی علامت سمجھتے ہیں حالانکہ بندہ صحرائی اور مردِ کہستانی سے مراد زندگی کی سختیوں اور مشکلوں پر قابو پانے والے اور موسموں کی شدت کا مقابلہ کرنے والے مراد ہیں کہ یہ فطرت کی سختیوں پر غالب آنے والے ہوتے ہیں۔ شہری زندگی کے برعکس صحرا اور کوہستان کے رہنے والے جفاکش اور سخت جان ہوتے ہیں۔

اساتذہ

مقصد ہو اگر تربیتِ لعل بدخشاں
بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو!
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ، کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو!
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو!

اگر سورج اپنے رستے سے بھٹکا ہوا ہو تو لعل بدخشاں کی تربیت نہیں ہو سکتی۔ یہاں اقبال اساتذہ کو بھی بھٹکے ہوئے کہتے ہیں۔ جو اساتذہ خود ہی علم و آگہی سے دور ہیں وہ نونہالوں کو کیا تربیت کریں گے۔

یہ مدرسہ اور مدرسہ والے بیچارے خود کہنہ روایات کے پھندوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہ طالب علموں کو کیا آگہی اور روشنی دے سکتے ہیں۔ اقبال نے اس نظم میں اپنا دل چیر کر سامنے رکھ دیا ہے امت مسلمہ کی تباہی جو ہر طرح کی ہے پر تڑپتا رہتا ہے۔ اس قوم کا اللہ ہی حافظ ہے جس کے اساتذہ خود روایات کے دلدل میں دھنسے اور پھنسے ہوئے ہوں۔

وہ لوگ دنیا کے امام کیا بنیں گے جو خود کہنہ دماغ ہیں اور اپنے زمانے کی تقلید پر مطمئن اور مسرور ہیں۔ ان تین شعروں میں اقبال نے دنیا کے عروج و زوال کی تاریخ بیان کر دی ہے۔ جو قومیں زوال پذیر ہوئیں پہلے ان کے اساتذہ و رہبر و رہنما راہ سے بھٹکے اس طرح انھوں نے پوری قوم کو زوال کی پاتال میں گرا دیا۔ بھٹکے ہوئے خورشید، روایات کے پھندوں، کیا مدرسہ،

تنگ ودو،کہنہ دماغ، پیرو،صدیوں کی کہانی بیان کرتے ہیں۔جب رہنما خودکہنہ دماغ ہوں اور پیروی میں سرور ہوں اساتذہ خودروایات کے پھندوں میں پھنسے ہوں تو کیا کریں گے۔ان کو خودروشنی کی ضرورت ہے۔کہنہ دماغی سے نکالنے کی ضرورت ہے۔

اقبال ڈور ہلاتے ہیں۔ جب اساتذہ کہنہ دماغی اور روایات کے پھندوں سے نکل کر ابداع اوراختراع اور تخلیقی قوت حاصل کریں گے تو پھر یہ طالب علموں کی ٹھیک تربیت کر سکیں گے۔تب ہی امت مسلمہ اس زوال سے نکل کر امامت کے مرتبے پر فائز ہوسکے گی۔

اہل مدرسہ ایک کھونٹے سے بندھے ہوئے ہیں۔ایک کنویں میں رہ رہے ہیں۔تقلیداور پیروی پر نازاں ہیں۔حالانکہ ان سے توقع تھی کہ وہ زمانے کی زمام سنبھالیں گےاورزمانہ ان کی پیروی کرے گا مگر افسوس کہ یہ خودروایات کے رسیااوراپنے زمانے کے مقلد ہیں!

دین و تعلیم

مجھ کو معلوم ہیں پیران حرم کے انداز
ہو نہ اخلاص تو دعویٰ نظر لاف و گزاف
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم!
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف!

چار اشعار پر مشتمل یہ نظم علم، عمل، دعویٰ اور حقیقت کی وضاحت اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے طوالت کے خوف سے دو شعر درج کیے ہیں۔

امت مسلمہ کو دو اطراف سے گھیرا جا رہا ہے۔ ایک حملہ آور تو خود پیران حرم یعنی ملا و صوفی ہیں ان کے دعویٰ کو اقبال لاف و گزاف کہتے ہیں۔ اور یہ پیران حرم اخلاص سے عاری ہیں۔ اخلاص کا لفظ اقبال کے ہاں کئی معانی میں آیا ہے۔ اخلاص سے مراد عمل بھی ہے۔ اخلاص سے مراد دل کی گہرائی سے یقین ہے۔ ایمان اور ایقان ہے۔ علم کے ساتھ جب عمل نہ ہو تو علم فائدہ کے بجائے نقصان دیتا ہے۔ اقبال ملاّ اور صوفی کے دعویٰ نظر کو لاف و گزاف قرار دیتے ہیں۔ نظر کا لفظ بھی اقبال کے ہاں

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی

بڑے وسیع معنوں میں آیا ہے اقبال صوفی اور ملا کے صاحب نظر ہونے کے دعویٰ کو بڑ قرار دیتے ہیں۔ اہل علم کے ایسے دعویٰ سے سب واقف ہیں۔ ملاّ کے ایسے دعویٰ کو طامات کہا جاتا ہے جس کے ذریعے وہ اپنی کرامات کی بڑھ ہانکتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ ایک طرف سے پیران حرم حملہ آور ہیں۔

تو دوسری طرف سے اہل کلیسا ہیں وہ اپنے نظام تعلیم کے ذریعے مسلمانوں سے ان کا دین اور مروت ختم کرنے کی سازش کررہے ہیں۔ انگریز حکمرانوں نے ہندوستان میں جونظام تعلیم دیا اس کے ذریعے مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے کی کوشش کی۔ اور یہ سازش اپنے اندر سہ شاخہ تیر کی خاصیت رکھتی ہے۔ ایک تو مسلمان اپنے دین سے دور ہوئے اور ان کے ردعمل میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا جو انگریزی تعلیم سے دور ہوتا گیا اور انھوں نے اس نظام تعلیم کے مقابل مدرسوں کا نظام جاری کیا۔ جس کے کچھ فائدے بھی ہوئے مگر ان مدرسوں نے فرقہ وارانہ تعصب کو ہوا دی۔ اس سے مسلمانوں کے اندر تفرقہ بازی کا زہر پھیل گیا۔

تیسرا یہ ہوا کہ اس کلیسائی نظام تعلیم سے نفرت کے سبب مسلمان سائنسی علوم کو بھی کلیسائی نظام تعلیم سمجھنے لگے۔ حالانکہ سائنس اور کلیسا کی جنگ بڑی لمبی اور شدید تھی اور آخرکار سائنس نے کلیسا کو شکست دے ہی دی۔

اس نظم میں اقبال موجودہ تعلیم کے نظام کو مسلمانوں کے خلاف سازش قرار دیتے ہیں۔ اور پھر جو مسلمانوں کو دین پر لگانے والے راہ راست پر رکھنے والے پیران حرم ہیں وہ بھی عمل اور اخلاص سے عاری ہیں اس نظم کے آخری شعر میں اقبال واضح کرتے ہیں کہ فطرت افراد کی غلطیوں سے صرف نظر کر لیتی ہے مگر بحثیت مجموی ملت کے گناہوں کو معاف نہیں کرتی! کیا کیا وضاحتیں نہیں واضح کیں اقبال نے!

جنوں

زجاج گر کی دکاں شاعری و مُلاّئی
ستم ہے خوار پھرے دشت و در میں دیوانہ!
کسے خبر کہ جنوں میں کمال اور بھی ہیں
کریں اگر اسے کوہ و کمر سے بیگانہ!
ہجوم مدرسہ بھی ساز گار ہے اس کو
کہ اس کے واسطے لازم نہیں ہے ویرانہ!

یہاں اقبال ملاّ اور شاعر کو ایک ہی صف میں کھڑا کر رہے ہیں کہ دونوں نے شیشہ گری کی دکان کھولی ہوئی ہے۔ یعنی کہ ان کے کام کی بنیاد مضبوط اور پائیدار نہیں ہے۔ شیشے کی طرح ناپختہ اور بے اعتبار ہے۔ دوسرے مصرعے میں دشت و در میں پھرنے والے دیوانے کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ستم ہے۔ شاعر و ملاّ سے زیادہ اخلاص دیوانے میں موجود ہے۔ اور وہ اپنے مقصد کو پانے کے لیے دشت و در میں خوار و زبوں پھر رہا ہے۔

اور یہ جنوں اگر کوہ و کمر سے حقیقت کی طرف پھر جائے تو دنیا میں کمالات ہوتے ہیں۔ اس دنیا کے اندر جتنی بھی ایجادات ہوئی ہیں تخلیقات ہوئی ہے جنوں ہی کے کمالات ہے۔

اور ایسے جنونی مدرسوں سے بھی نکلے ہیں جنھوں نے دلوں اور دماغوں کو روشنی بخشی اور وقت کے پہیے کو اپنی مرضی سے چلایا۔ ایسے جنونیوں کے لیے ویرانہ ضروری نہیں۔

اقبال کے من میں ڈوبی ہوئی خواہش ابھری کہ ان مدرسوں سے ایسے جنونی نکلیں جو دنیا کو اپنے کمالات دکھا دیں! دنیا کو تسخیر کرنے اور اس کا راکب بننے کی طرف اشارہ ہے۔

سرودِ حرام

نہ میرے ذکر میں ہے صوفیوں کا سوز و سرور
نہ میرا فکر ہے پیمانہ ثواب و عذاب
خدا کرے کہ اسے اتفاق ہو مجھ سے
فقیہہ شہر کہ ہے محرمِ حدیث و کتاب
اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

میرے ذکر میں صوفیوں کا سوز اور سرور نہیں
میرے فکر میں ثواب وعذاب کا ترازو بھی نہیں

کہ یہ کرو گے تو ثواب ہوگا یہ کرو گے تو عذاب ہوگا۔ اور نہ ہی جیسے صوفی قوال کی آواز سے سوز وسرور کی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔ میرا ذکر کرنے کا طریقہ بھی اُن جیسا نہیں ہے۔

دوسرے شعر میں اقبال فرماتے ہیں کہ خدا کرے کہ فقیہہ شہر جو حدیث و کتاب یعنی قرآن حکیم کی تعلیم کا علم رکھتا ہے یا علم کا دعویٰ کرتا ہے۔ خدا اُسے توفیق دے کہ وہ میری بات سے اتفاق کرے کہ ایسی نوا جو بےعمل کرے جدوجہد سے عاری کرے۔ زندگی اور زندگی کی تگ ودو سے دور سستی، کاہلی، بےعملی کی موت طاری کردے میری فکر ونظر میں حرام ہے اور فقیہہ شہر جس سے عام مسلمان حرام اور حلال کے بارے پوچھنے جاتے ہیں خدا کرے وہ میری بات سے اتفاق کرے۔

ایسا سرود جو بے علمی اور کم ہمتی اور موت طاری کرے میری نظر میں حرام ہے۔خدا کرے کہ فقیہہ شہر بھی میری اس بات سے اتفاق کرے۔اس سے یہ ہوگا کہ فقیہہ کے فتویٰ سے مسلمانوں پر طاری افسردگی کم ہوگی ختم ہوگی۔زندگی کی حرارت اور قوت پیدا ہوتو ایسا سرود حرام نہیں مگر بات پھر فقیہہ شہر کے اتفاق اور اختلافات پر آ کر رک گئی ہے۔

maablib.org

مردِ بزرگ

مثلِ خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ' معانی میں دقیق!
اس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیران طریق

مرد بزرگ کی فکر کی تابانی سورج کی روشنی کی طرح ہوتی ہے۔ بات کرنے کا انداز سادہ ہوتا ہے مگر اس میں حکمت بھری ہوتی ہے۔ جس طرح سورج اس دنیا کی ہر چیز اور انسان کو زندگی اور نمو عطا کرتا ہے اسی طرح مرد بزرگ کی دانائی انسان اور انسانیت کو زندگی اور صحت عطا کرتی ہے اور صحت مند معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ لگے بندھے اصولوں اور روایات کے پابند لوگوں سے اس کا انداز فکر ونظر اور عمل الگ ہوتا ہے اس مرد بزرگ سے اہل طریقت آگاہ نہیں ہوئے۔ کہاں یہ روایات میں گرفتار اور فکر کی تابانی سے محروم لوگ اور کہاں یہ مرد بزرگ جس کی فکر مثل خورشید تاباں ہے۔ اقبال نے مثل خورشید سحر۔ فکر کی تابانی احوال سے محرم نہیں۔ پیران طریق۔ میں صدیوں کے احوال روشن کر دیے ہیں۔ پیران طریق کی روش اور انداز بھی بیان کر دیے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ پیران طریق، احوال اور محرم نہیں، کے الفاظ میں سب کہہ دیا ہے۔

رقص

چھوڑ یورپ کے لیے رقص بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے ضرب کلیم اللہی!
صلہ اُس رقص کا ہے تشنگیٔ کام و دہن
صلہ اِس رقص کا درویشی و شاہنشاہی!

جسمانی رقص اوراس کے پیچ وخم یورپ کے لیے چھوڑ دے کہ اس کا حاصل کام ودہن کی تشنگی ہے۔

اپنی روح کو رقص میں لا کہ اس کا حاصل ضرب کلیم الٰہی ہے۔اوراس سے درویشی اور شہنشاہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں درویش شہنشاہ ہوتا ہے اور شہنشاہ کے اندر دویشی سمائی ہوتی ہے۔ایک شخصیت میں درویشی اور شہنشاہی کا ملاپ ہی وہ بلند مقام ہے جو بلند کرداری اور بڑی جستجو کے بعد ملتا ہے۔درویشی اور شہنشاہی جب ایک وجود میں یکجائی اختیار کرتی ہے تو درویش کے اندر شاہی استغنا پیدا کرتی ہے اور شہنشاہ کے اندر درویشی پیدا ہوتی ہے۔حضرت عمر فاروقؓ ایک درخشندہ ستارہ ہیں جن کی شہنشاہی اس کو اگر شہنشاہی کہا جاسکتا ہے تو اس میں درویشی جھلکتی ہے۔

نفسیاتِ غلامی

شاعر بھی ہیں پیدا علما بھی، حکما بھی،
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ!
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضا مند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ!

شاعر، علما، حکما تینوں طبقے قوموں کو فکر و عمل پر ابھارنے والے ہیں مگر جب کوئی قوم غلام ہو تو یہ تینوں طبقے علما بھی حکما بھی اور شعرا بھی غلام قوم کے اندر خوئے غلامی مستحکم کرنے کا کام کرتے ہیں۔ اور اس کے لیے تاویل مسائل کو ذریعہ بناتے ہیں۔ کہیں اور بھی اقبال علما کا تاویل کے ذریعے قرآنی تعلیمات کو بدلنے کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں بھی مسائل کو کھینچ تان کر صاحبان اقتدار کی اطاعت کے لیے عام مسلمانوں کو راضی کر لیتے ہیں۔

جیسے امیر المومنین کی اطاعت لازمی قرار دیتے ہیں۔ غلام مسلمانوں کو غلامی اور اطاعت پر علما ہی لگاتے ہیں!

maablib.org

خواجگی

دورِ حاضر ہے حقیقت میں وہی عہدِ قدیم
اہلِ سجادہ ہیں یا اہلِ سیاست ہیں امام
اس میں پیری کی کرامت ہے نہ میری کا ہے زور
سینکڑوں صدیوں سے خوگر ہیں غلامی کے عوام!
خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی
پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام

اقبال نے اس چھوٹی سی نظم میں سینکڑوں صدیوں کی حقیقت بیان کردی ہے۔ دور حاضر بھی عہد قدیم ہے۔ ہندوستان میں یا تو اہل سجادہ یعنی گدیوں کے گدی نشیں یعنی پیری مریدی کرنے والے پیر یا پھر اہل سیاست امام بنے ہوئے ہیں۔

اسی کی وجہ یہ ہے کہ سینکڑوں صدیوں سے یہاں کے عوام غلامی کے طوق میں جکڑے ہوتے ہیں۔ ان کی سوچ فکر اور عقل غلامی کی خوگر ہے۔ وہ بڑے شوق سے غلام فلاں غلام فلاں کہہ کر تعارف کرواتے ہیں غلام اللہ اور غلام رسول تو ایک مسلمان کے لیے قابل فخر اور قابل عزت بات ہے مگر غلام فلاں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ غلامی کو بھی فخر کا سبب سمجھتے ہیں۔ اس میں پیروں کی پیری کی کرامت نہیں اور نہ ہی سیاست دانوں کی سیاست کا کوئی گر ہے وجہ یہی ہے کہ عوام غلامی کے عادی بن چکے ہیں۔

اور جب غلاموں میں خُوئے غلامی پختہ ہو جاتی ہے تو پھر آقائی میں خواجگی میں یعنی پیر بننے میں کوئی مشکل نہیں رہتی۔

ہندوستان میں آریاؤں کی آمد اور دوسری اقوام اور آخر میں سلاطین اور پھر مغل اور پھر انگریز حکمران ہوئے۔ آریہ لگ بھگ تین سے سات ہزار قبل مسیح آئے اور انگریز 1757ء میں مستحکم ہو گئے اور اقبال کی وفات کے بعد 1947ء میں پاک و ہند سے گئے۔ مگر گئے کب ایک دوسرے اور ٹکڑے انداز میں موجود ہیں۔ ہندوستان کے رہنے والے غلامی کے عادی ہو چکے ہیں۔ اپنے آپ کو غلام اور حقیر گردانتے ہیں، مریضانہ فخر محسوس کرتے ہیں۔

maablib.org

ابلیس کا فرمان
اپنے سیاسی فرزندوں کے نام

لا کر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں
زناریوں کو دیرِ کہن سے نکال دو!
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو!
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو!
افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو
اہلِ حرم سے ان کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو
اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

ابلیس مسلمانوں کی تباہی کے لیے اپنی سیاسی اولاد کو کیا کیا طریقے بتاتا ہے۔ پہلے شعر میں برہمنوں کے بارے ہے۔ دوسرے میں ایک مسلمان کے بدن سے روح محمد نکال دو۔ روح نکل گئی تو بدن غلام ہو جائے گا۔ فکر عرب مسلمانوں کے دلوں اور ذہنوں سے نکال کر اسلام کو حجاز و یمن سے نکال کر در بدر کر دو۔ فکر عرب اقبال اس بات پر بہت زور دیتے ہیں فکر

عرب اسلامی روح اور فکر عجم غیر اسلامی گردانتے ہے۔ فکر عرب نکل گئی تو غیر اسلامی عناصر اسلام میں داخل ہو گئے۔ افغانیوں کی غیرت دین کا یہ علاج ہے کہ ملاّ کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو۔ یہاں اقبال ملاّ کے کردار کے معترف ہیں۔ ایسے ملا جو اسلام کے محافظ ہیں۔ اہل حرم یعنی اہل شریعت اور اہل طریقت سے ان کی عرب روایات اسلام چھین لو ایسے جیسے مرغزار کے ہرن کو مرغزار ختن سے نکا دیا جائے۔ اور ابلیس اپنے سیاسی فرزندوں کو یہ بھی کہتا ہے کہ اقبال کی آواز سے لالے کی آگ تیز ہو رہی ہے۔ مسلمان سمجھ رہے ہیں جاگ رہے ہیں۔ سمجھنے کی طرف آ رہے ہیں یہ آواز اگر اس طرح بلند ہوتی رہی تو مسلمان قوم خواب غفلت سے جاگ جائے گی۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ایسے غزل سرا کو چمن ہی سے نکال دو۔ ایسے غزل سر کو لاؤ جس کی لے سے مسلمان پھر خواب خرگوش میں کھو جائیں۔ اس میں بھی اقبال سیاست کے پیچ و خم جو غلام مسلمانوں کے لیے برتے جا رہے ہیں۔ ان کی قلعی اتار رہے ہیں!

maablib.org

غلاموں کی نماز

(ترکی وفد ہلال احمر لاہور میں)

کہا مجاہدِ ترکی نے مجھ سے بعدِ نماز
طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام؟
طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور کیا ہے کام
خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام!

اقبال تاریخ فلسفہ قانون دینی علوم کے ساتھ ساتھ شعور لاشعور قبل شعور ماقبل شعور اجتماعی شعور۔ اجتماعی لاشعور پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اجتماعی شعور اور اجتماعی لاشعور کی گرہیں جس طرح اقبال نے کھولیں ہیں یہ ان ہی کا کام ہے۔ جب قوموں سے وقار عزت اور حمیت چھن جاتی ہے تو وہ کس طرح پناہ گاہیں تلاش کر لیتی ہیں۔ اقبال پوری طرح تاریخی طور پر اس سے آگاہ ہیں اور امت مسلمہ کو بھی آگاہ کرتے ہیں۔ ایک نظم نفسیات غلامی میں امراض امم کے اسباب کھول کر بیان کرتے ہیں ہم کسی مخصوص واقعہ کی طرف نہیں جاتے کیونکہ اقبال بھی واقعات کو عمومی انداز دے کر اُن خاص واقعات کو سماج اور مسلمان کے ساتھ جوڑ کر امراض کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس نظم میں بھی ترکی وفد نے بادشاہی مسجد میں نماز جمعہ ادا کی۔ نماز کے بعد رئیس وفد نے اقبال سے پوچھا کہ تمھارے امام کیوں اس قدر طویل سجدے کرتے ہیں۔

اقبال نے اس خاص سوال کو اجتماعی انداز میں بیان کر کے مسلمانوں کے ذہنوں کی نہج کی وضاحت کر دی۔ مرد مجاہد اور مردان حُر کے ذوق عمل سے قوموں کے نظام قائم ہوتے ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں کہ غلاموں کا بدن سوز عمل سے محروم ہوتا ہے۔ دنیا کے زمام کار اور حکمرانی اور ذوق عمل سے محروم مسلمانوں کے امام سجدوں کے علاوہ کسی کام میں طاق نہیں ہیں اور ہزاروں سجدوں کے اسیر ہو چکے ہیں کیونکہ وہ ایک سجدہ جو ہزاروں سجدوں سے نجات دیتا ہے وہ ابھی ان کو نصیب نہیں ہے اور وہی ایک سجدہ ملت کے لیے زندگی کا پیغام ہوتا ہے۔ مگر افسوس کہ زندگی تحرک جدو جہد اور تگ و دو سے محروم امام ہزاروں سجدوں کے تو عادی ہیں مگر

وہ ایک سجدہ جو ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اس سے دُور ہیں۔ اقبال نے رئیس وفد کے سوال کو ہندوستان کے اماموں کے طویل سجدوں کی حقیقت بتا دی ہے!

اس میں گہرا سماجی تاریخی شعور اور گہری انفرادی اور اجتماعی شعور اور لاشعور سے آگاہی نظر آتی ہے۔ ایک اور جگہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اقبال نے افراد کی غلطیوں کو فطرت کے درگزر کرنے اور ملت کی غلطیوں سے اغماض نہ کرنے کا بتایا ہے۔ یہ بھی تاریخ کا سماجی اور انفرادی نفسیاتی مطالعے ہی کے سبب ہے بے شک اقبال نے نفسیات، تاریخ اور سماج کے لیے خاص ٹرمنالوجی وضع نہیں کی کیونکہ وہ اس سے زیادہ ضروری کام میں مصروف تھے۔

maablib.org

محراب گل افغان کے افکار

○

قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ!

اس میں اقبال ایسے درویش کو جو سلطانوں حکمرانوں کے در پر حاضری نہیں دیتا کو قوموں کی تقدیر بدلنے والا سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے جو درویش امرا اور سلاطین کے در پر جاتا ہے وہ اصلی درویش نہیں بلکہ

سلطانی بھی عیاری ہے درویشی بھی عیاری ہے

اور جو ان امرا اور سلاطین سے دور رہتا ہے وہی امت مسلمہ کے اندر خودی انا عزت اور حرکت و عمل پیدا کر کے اس کو راہ عمل پر لگائے گا۔

○

یہ مدرسہ یہ کھیل یہ غوغائے روارَو
اس عیش فراواں میں ہے ہر لحظہ غمِ نَو!
وہ عِلم نہیں، زہر ہے احرار کے حق میں
جس عِلم کا حاصل ہے جہاں میں دو کف جَو

پانچویں بند کے ان دو شعروں میں اقبال نظام تعلیم جو انگریزوں نے ہندوستان میں جاری کیا ظاہری طور پر تو بڑا دلکش نظر آتا ہے مگر یہ درس گاہیں علم نہیں پھیلا رہین بلکہ علم کے

پردے میں ملت احرار کے نوجوانوں کی رگوں میں زہر انڈیل رہی ہیں۔ایسا علم جس کا ثمر شکم پروری ہو۔وہ قوموں کے ذہنوں میں تبدیلی نہیں لاسکتا۔نہ اُن کو جدوجہد اور تگ ودو کا درس دیتا ہے۔بلکہ ان کو قوم سے کاٹ کر فقط اپنی ذات میں محدود کر دیتا ہے وہ نوکری کے چکر میں سرگرداں رہتا ہے۔قوم کی تربیت اس کا مقصد نہیں رہتا۔سو سال بعد بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کا فکر آج بھی اپنی حقانیت پر قائم ہے۔قریب قریب تمام تعلیمی ادارے شکم پروری میں مگن ہیں بلکہ اب تو مدرسے ایک انڈسٹری کا روپ دھار چکے ہیں جیسے کاٹن انڈسٹری۔اس طرح مدرسے بھی!

○

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مردہ ہے، مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

اس ایک شعر میں اقبال نے قوموں اور خاص طور پر محکوم قوموں کے تعلیم کے نظام کی بیماریوں کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔ظاہری طور پر تو ان مکتبوں مدرسوں کے طالب خوب صورت اور بنے سنورے اور فلسفیانہ گفتگو کرتے۔جدید اور قدیم کے مباحث میں الجھے نظر آتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان میں زندگی موجود ہے مگر حقیقت میں یہ جوانان قوم مردہ ہیں۔ان کی روح مردہ ہے۔ذوق عمل اور سوز دل اور دینی حمیت اور مشرقی مزاج سے دور ہٹ چکے ہیں۔ان کے بدن سے عربی روح نکل چکی ہے۔اور فرنگی روح ان کے جسم میں موجزن ہے اور لہک چہک اور ظاہری نمائش اس فرنگی نفس کی بدولت نظر آتی ہے۔زندہ نظر آتا ہے مگر

مردہ ہے!
مانگ کے لایا ہے
فرنگی سے نفس!
مانگی ہوئی چیز کی پائیداری؟

O

اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے
ہے ان کی نمازوں سے محراب تُرش ابرو!

شیخ صاحب سے کہا جا رہا ہے کہ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے۔ محلے کے شہر کے ملک کے امیر سے امرا کی طرف بھی اشارہ ہے۔ ان کو مسجد سے نکلوا کہ ان کی نمازوں سے محراب ناخوش اور ناراض ہے۔ بے روح نمازیوں کی طرف رخ ہے اور ایک رخ شیخ صاحب کی طرف بھی لگتا ہے شیخ ان امیروں کو خاص کا درجہ دیتا ہے اور غریبوں کو عام، تو اس وجہ سے بھی محراب مسجد ناخوش و ناراض ہے کیونکہ

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

مسجد میں بندہ و آقا امیر اور غریب کی تفریق پر شیخ صاحب کو بلواسطہ جتایا گیا ہے!

O

کر سکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی
اے پیرِ حرم تیری مناجاتِ سحر کیا؟
ممکن نہیں تخلیقِ خودی خانقہوں سے
اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا!

پہلے شعر میں پیر حرم سے سوال کہ صبح کی تیری مناجات بے معرکہ زندگی کی تلافی کر سکتی ہے۔ اقبال بعض اوقات سوال کو اس انداز میں اٹھاتے ہیں کہ جواب اس سوال میں موجود ہوتا ہے۔ یہاں بھی اقبال کہتے ہیں کہ صرف دعاؤں اور مناجاتوں سے حق و باطل کے معرکوں سے نبرد آزما نہیں ہوا جا سکتا۔ تم یعنی پیران حرم یعنی اہل شریعت و اہل تصوف مناجاتوں کے زور سے دنیا پر غالب آنا چاہتے ہو یہ حقیقت سے دور ہے۔ شررِ بولہبی کے مقابل چراغ مصطفوی

جلانا پڑتا ہے۔دوسرے شعر میں پھر خانقاہی نظام پیری مریدی اور گدی نشینی کی بات کرتے ہیں اور فرماتے ہیں یہ خانقاہیں اب خودی کی تخلیق نہیں کرسکتیں کیونکہ یہ جو کبھی شعلہ تھیں اب اس شعلے کو پانی نے اس کے اندر کا سوز اور ذوق اور عمل اور خودی کو ختم کردیا ہے۔جس شعلے کو پانی پڑا وہ کیا چنگاری پیدا کرے گا۔دونوں شعروں میں پیران حرم اور خانقاہی نظام کے شعلہ جوالہ سے محروم اور خودی سے عاری ہونے پر اقبال نوحہ کناں ہیں! ان دونوں طبقوں سے صفات یدالٰہی چھن چکی ہیں تو اس پر نوحہ ہی کیا جاسکتا ہے!

O

خودار نہ ہو فقر تو ہے قہرِ الٰہی
ہو صاحبِ غیرت تو ہے تمہیدِ امیری!

فقر اگر خوددار نہ ہو تو اس کو فقر مت سمجھو یہ قہر الٰہی ہے۔یہ اللہ کا قہر ہے جو امت مسلمہ پر نازل ہوا ہے۔اور اگر صاحب غیرت ہو تو امیری کی تمہید ہے۔جب اہل فقر صاحب غیرت تھے خوددار تھے۔سلاطین کے دروازوں پر نہ جاتے تھے تو اس وقت پوری مسلمان قوم کے اندر بھی انا عزت غیرت خودی مستحکم تھی اور دنیا پر حکمران تھی۔دشت و دریا وصحرا ان کی ٹھوکر سے دو نیم تھے مگر جب فقر خوددار نہ رہا تو یہ امت مسلمہ پر قہر الٰہی عذاب الٰہی کی طرح نازل ہوا۔اس کو فقر نہ سمجھو یہ خدا کا عذاب ہے۔فقر تو وہ ہے جو خود بھی صاحب غیرت ہو اور خوددار ہو۔اور ایسا فقر دنیا میں سلطانی عطا کرتا ہے۔اقبال مسلمانوں کی بیماریوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں اور علاج بھی ساتھ ہی بتاتے ہیں۔فقر کی بیماری خودداری سے تہی دست ہونا ہے۔اور فقر کی صحت اہل فقر کا خوددار ہونا ہے!

دو لائنوں میں تصوف کی پوری تاریخ تمام اوصاف اور لاحق امراض کو وضاحت کے ساتھ بیان کردیا ہے۔اس سے پہلے شعر میں اگر فولاد کے اندر سے اس کا فولادی جوہر ختم ہو جائے اور اس کی جگہ ریشم لے لے تو وہ تلوار بنانے کے کام نہیں آتا۔اس طرح فقر سے خود داری اور غیرت نکل جائے تو اپنے جوہر سے خالی ہو جاتا ہے۔

○

جو فقر ہُوا تلخیٔ دوراں کا گِلہ مند!
اس فقر میں باقی ہے ابھی بوئے گدائی!
اس دور میں بھی مردِ خدا کو ہے میسّر
جو معجزہ پربت کو بنا سکتا ہے رائی!

ایسا فقر جو زمانے کے ناسازگار اور ناموافق مزاج کا گِلہ کرے ایسے فقر میں گدایانہ مزاج ابھی باقی ہے۔ خوددار اور باغیرت فقر گردش دوراں اور زمانے کے ناموافق ہونے کا گلہ نہیں کرتا جو گلہ کرتا ہے گدائی کا مزاج اس سے موجود ہے ختم نہیں ہوا۔

دوسرے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ اس زمانے میں بھی ایسے مردان خدا موجود ہیں جو معجزے دکھا سکتے ہیں۔ یہاں اقبال کی معجزے سے مراد ایسے کام ہیں جو عام مسلمان ناممکن قرار دیتے اور سمجھتے ہیں۔ جن پہاڑوں کو کاٹنا یا عبور کرنا عام لوگ مشکل اور ناممکن سمجھتے ہیں مردان خدا ایسے پہاڑوں کو عبور کر سکتے ہیں کاٹ کر رائی بنا سکتے ہیں۔

سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

مگر شرط ہے کہ مسلمان پیران حرم اور صوفی و ملاّ کے اندر خودی، انا، عزت غیرت اسی رنگ میں آ جائے جس رنگ میں پہلے موجود تھی تو پھر معجزے یعنی ناممکن کام بھی ممکن اور آسان ہو جائیں گے۔ تلخی دوراں کا گلہ کرنے کی بجائے زمانے کی لگامیں اپنے ہاتھوں میں لینے والے قلندر بننے کی کوشش کرنی چاہیے!

O

ہوتا ہے کوہ و دشت میں پیدا کبھی کبھی
وہ مرد جس کا فقر خزف کو کرے نگیں!

اقبال جس فقر کے منتظر ہیں کے بارے میں کہتے ہیں کوہ و دشت میں کبھی کبھی پیدا ہوتا ہے۔اور اقبال کے لفظوں میں مچلتی یہ خواہش نظر آتی ہے کہ کاش، شاید، اللہ کرے۔ایسا مردِ فقیر میرے زمانے میں پیدا ہو۔جس کے فقر سے ٹھیکری بھی نگینہ بن جائے۔یعنی مسلمان قوم جو دنیا میں اب ایک ٹھیکری ہی کی طرح بے وقار پست اور خاک آسودہ ہے اس کے فقر کی نظر سے انا والی، عزت والی، رعب والی دبدبے والی ذوق والی بن جائے۔اقبال ایسے ہی اہل فقر اور مردانِ حق اور مردانِ حُر کا انتظار کرتے ہیں۔اقبال کی یہ خواہش کہ مسلمان اس پستی سے نکل کر بلندیوں پر جائیں کیونکہ زیرِ پرآسماں آجائے تو زمین نظر آتا ہے اور بالائے سر ہو تو آسمان اس کا نام ہے!

حقیقی اہل فقر کا منتظر ہے اقبال۔

O

وہی حرم ہے وہی اعتبارِ لات و منات
خدا نصیب کرے تجھ کو ضربتِ کاری!

وہی حرم ہے خانہ خدا ہے۔اور وہی بُت جو عہد جاہلیت میں خانہ کعبہ میں موجود تھے لات منات کے ناموں سے۔

پھر ان بتوں کو خانہ خدا سے نکال دیا گیا۔کعبہ کو ان سے پاک کر دیا گیا۔مگر آج لات منات شکل بدل کر صورت بدل کر مختلف ناموں اور مختلف صورتوں میں مسلمانوں کے اندر پھر اعتبار حاصل کر چکے ہیں۔اس سے پہلے تین اشعار میں افغانی مسلمانوں کا قبیلوں میں تقسیم ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔

خاندان کا بت، قبیلے کا بت، انا کا بت، ضد کا بت، مفادات کا بت، ہزاروں بت ہیں جن کی پوجا لات ومنات کی طرح کی جارہی ہے۔

○

دنیا میں محاسب ہے تہذیبِ فسوں گر کا
ہے اس کی فقیری میں سرمایۂ سلطانی!
اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن
بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی!

تہذیب فسوں گر کا محاسب ایسا فقر بن سکتا ہے جس کے فقر میں سلطان کے اوصاف ہوں۔ دنیا پر جو تہذیب افرنگ کی جادوگری چھائی ہوئی ہے اس کا توڑ اہل فقر ہی کر سکتے ہیں مگر ایسے اہل فقر جن میں سلطانی کے اوصاف ہوں نا کہ ایسے اہل فقر جو سلطانوں کے در پر حاضری دینے والے ہوں۔

اے شیخ تیرے مکتب کی فضا اچھی ہے مگر حضرت عمر فاروقؓ اور سلمان فارسی کے کردار بیاباں کی فضا میں پروان چڑھتے ہیں۔ ظاہری طور پر سکول کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پڑھنے اور پڑھانے والے ناک بھوں چڑھائیں گے مگر سادہ انداز میں اُن سے پوچھا جا سکتا ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ جیسے فقر اور حضرت عمر فاروقؓ جیسے سلطان ان مکتبوں سے پیدا کیوں نہیں ہوتے۔ ان مباحث پر ہزاروں صفحے لکھے جا سکتے ہیں۔ وہی

مکتب کی کرامت

فیضان نظر

موجود شیخ اور مکتب اور اہل فقر سے نا امیدی مگر امید بھی موجود!

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ

پہلا مشیر

یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صُوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام!
طبعِ مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ ''قوالی'' سے کچھ کمتر نہیں ''علم کلام''
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام!
کس کی نومیدی پہ حجت ہے یہ فرمانِ جدید؟
'ہے جہاد اس دور میں مردِ مسلماں پر حرام'!

1917ء روسی معاشی وسیاسی انقلاب کارل مارکس کی فکری بنیاد پر ہوا۔

1932ء اٹلی میں مسولینی اور جرمن میں ہٹلر اور جاپان اور سپین میں آمرانہ نظام۔

1939ء میں دوسری جنگ عظیم ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم سے چھ سال پہلے یہ نظم لکھی گئی۔

1936ء میں ہندوستان میں ترقی پسند جماعت وجود میں آئی۔ کارل مارکس کے نظریات کے زیر اثر۔

ان چار اشعار سے پہلے ابلیس کا خطاب ہے جس میں ابلیس اپنے کارنامے گنواتا ہے۔

میں نے فرنگیوں کو ملوکیت سکھائی۔ مسجد وکلیسا کا جادو بھی تھوڑا۔غریبوں نے تقدیر میں پناہ لی اور سرمایہ داروں کو پیسے کا لالچ میں نے ہی دیا۔اسی سوچ اور فکر کو جو میں نے آج کے انسانوں میں ڈال دی ہے کون کم کرسکتا ہے۔

اس کے بعد پہلا مشیر کہتا ہے ، ہماری محنت پہ ابلیس کا نظام قائم ہے۔ابلیس کا مشیر پہلے شعر میں کہتا ہے کہ ہماری مسلسل لگاتار کوشش سے صوفی وملاّ سلاطین کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ابلیس اسلام کے پیغام سے خوف زدہ ہے۔ مارکسی نظام کو بھی خاطر میں نہیں لاتا صرف اور صرف اسلام کے فکر اور پیغام سے ڈراتا ہے۔ ظاہر ہے فکر اور سوچ ٹھیک ہو تو صوفی اور ملاّ سلاطین کے در پر نہیں جاتے جب وہ بادشاہوں کی غلامی میں آ جاتے ہیں تو پھر وہ خدا کے بندے نہیں رہتے بلکہ سلاطین کے بندے بن جاتے ہیں۔ جب صوفی اور ملاّ بادشاہوں کے غلام بن گئے تو ان کے دیکھا دیکھی عام مسلمان بھی بادشاہوں کے غلام بن گئے۔

دوسرے شعر میں افیون، قوال، اور علم کلام اور طبع مشرق کا ذکر کر کے بات کو اتنا روشن اور واضح کر دیا ہے کہ کسی اور دلیل کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

مکار اور چالاک یورپیوں نے مشرق کو ان ہی حوالوں سے خوب صورت بنا کر پیش کیا۔ بیسویں صدی میں اقبال اور اب ایڈورڈ سعید نے سو سال بعد ثقافت اور سامراج میں واضح کیا ہے۔

وہی مسلمان جو مرد میدان تھے۔ باعمل تھے باکردار تھے متحرک تھے جدو جہد وسعی پیہم کے عادی تھے۔اُن کے تصوف کو قوالی اور علم کلام کے ذریعے سے خوب صورت اور روحانی طور پر پیش کر کے ان میں سستی کاہلی نا امیدی بے عملی پیدا کر دی۔قوال بھی سماع کی محفلوں میں سننے والوں پر وجد طاری کر دیتے ہیں۔ علم کلام میں علما بھی اپنے لیے بیچ کا رستہ نکال کر جدو جہد و پیکار سے دور ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی کاہل اور حرکت سے عاری کر دیتے ہیں۔ جس طرح افیون قوموں کو تباہ کر دیتی ہے۔

قوالی اور علم کلام نے بھی طبع مشرق اور خاص طور پر مسلمانوں کیونکہ قوالی اور علم کلام مسلمانوں ہی سے وابستہ ہیں کو افیونیوں کی طرح کر دیا ہے۔ جس طرح افیون قوم کے لیے نقصان دہ ہے اسی طرح قوالی اور علم کلام نے بھی مسلمانوں کو نقصان پہنچایا ہے۔

تیسرے شعر میں اسلام کے اہم رکن حج اور طواف کا ذکر کیا ہے۔ حج امت مسلمہ کو سال میں ایک بار اکٹھے ہونے خدائے وحدہ لاشریک کے سامنے لبیک اللھم لبیک کا آوازہ بلند کر کے دنیا کے جھوٹے خداؤں کے وجود سے انکار کرنے کا عمل ہے۔ آپس میں ایک دوسرے سے ملنے اور مل کر خدائے واحد کا اقرار کرنا ہے۔ ابلیس کا مشیر کہتا ہے کہ ہم نے کوشش کر کے طواف اور حج کا جو اصل مقصد تھا جو اصل روح تھی وہ اس عمل سے نکال دی ہے۔ اب صرف حرکت ہے۔ مسلمان طواف کعبہ کر رہے ہیں اور زبان سے لبیک اللھم لبیک بھی بلند کر رہے ہیں مگر ہماری کوشش سے یہ صرف حرکت جسمانی اور حرکت زبان ہے۔ عمل اور روح ہم نے کھینچ لی ہے۔ مومن کے جو اوصاف ہیں وہ ہم نے مسلمان میں باقی نہیں رہنے دیے۔ تیغ بے نیام کو ہم نے کند کر دیا ہے۔ اب مومن کی تیغ بے نیام بھی نہیں اور کند بھی ہو چکی ہے۔ اس لیے اس کے طواف و حج سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اس کی بدنی اور زبانی حرکت ہے۔ جوہر غائب ہے۔

کیونکہ

ہم نے کوشش سے ایسے مسلمان بنا لیے ہیں جو جہاد کو پرانے وقتوں کی چیز قرار دیتے ہیں۔ جہاد کو حرام کہنے سے کیا یہ واضح نہیں ہوتا کہ مسلمان ناامید اور بزدل ہو چکے ہیں ان کی تیغ کند ہو چکی ہے۔

پہلا مشیر مسلمانوں کو بے جوہر کر دینے کا کہتا ہے۔

maablib.org

اپنے مشیروں سے

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

ابلیس کے پانچوں مشیر (یہ یاد رہے انسانی حواس بھی پانچ ہی ہیں) مختلف مشورے دیتے اور اپنے کارنامے بتاتے ہیں۔ کارل مارکس جرمنی اور اٹلی سے بھی ڈراتے ہیں مگر ابلیس کہتا ہے۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے، جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے!

چونکہ ابلیس کسی اور نظام سے خوف زدہ نہیں صرف اسلام کے پیغام سے ڈرتا ہے تو اپنے مشیروں کو سمجھاتا ہے کہ مسلمان اس کے عالم اس کے صوفی تمام کے تمام کو الھیات میں الجھاؤ رکھو۔ اور کتاب اللہ کی تاویلات میں لگائے رکھو۔ اگر یہ الھیات اور تاویلات سے نکل کر اصل قرآنی روح کی طرف آ گیا تو ہمارے یعنی ابلیس کے نظام کے لیے بڑا خطرہ ہے۔

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

اگر اس پر پیغمبر کا پیغام اپنی اصل صورت میں واضح ہو گیا تو دنیا میں قائم ابلیسی نظام دھڑام سے نیچے آ جائے گا۔ اس لیے اس کو تاویلات قرآن اور الھیات کے معاملات اور مسائل میں الجھائے رکھو۔ مجھے یعنی ابلیس کو علم ہے۔

جانتا ہوں مَیں یہ امت حاملِ قرآں نہیں

ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

یہ بھی ہے کہ

بے یدِبیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

پیران حرم کے آستینوں ید بیضا سے تہی ہے۔ضرب کلیمی اور ید بیضا سے عاری پیران حرم صوفی وملاوہی کرر ہے ہیں جوابلیس کی خواہش ہے۔

○

کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اس دور میں

یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟

ہے وہی شعر وتصوف اس کے حق میں خوب تر

جو چھپادے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

اس بند میں ابلیس کہتا ہے کہ جن مسلمانوں کی تکبیروں نے دنیا کے ظالم نظام کی زنجیریں توڑ دی تھیں اس پر چھائی تاریک رات کوروشن نہیں ہونے دینا۔ابن مریم مر گیا کہ زندہ ہے۔ صفات خدا،خدا سے الگ ہیں اور یا عین ذات ہیں مجدد اور حضرت عیسیٰ ایک ہی ہستی ہیں؟اور قرآن پاک کے الفاظ قدیم میں یا حادث ہیں۔اور مسلمان کی کس عقیدے میں نجات ہے۔ ایسے ہی مسائل میں الجھار ہے یہ ان لات ومنات جو الھیات نے تراشے ہیں ان ہی کی عبادت میں لگار ہے۔اور

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے

اور قیامت تک یہ انھی باتوں میں الجھا رہے اور کردار سے عاری رہے وہی شعر اور وہی تصوف اس کے لیے بہتر ہے (مگر جو درحقیقت اس کے لیے نقصان دہ ہے) جو اس کی آنکھوں سے زندگی کی حقیقتوں کو چھپائے رکھے۔ یہ تصوراتی اور تخیلاتی دنیا ہی میں کھویا رہے۔ یہاں پر اقبال شعر اور تصوف یعنی شاعر اور صوفی کو ایک ہی صف میں کھڑا کر رہے ہیں۔ دونوں کے اثرات سماجی زندگی پر بڑے شدید اور دور رس ہوتے ہیں اس لیے اقبال بار بار ان مضر اثرات کی نشاندہی کرتے اور ان سے بچنے کا کہتے ہیں۔ مگر ابلیس ایسے شاعروں اور صوفیوں سے خوش ہے کہ ان نے مسلمانوں سے ان کا کردار چھین کر تصورات اور تخیلات میں گم کر دیا ہے اور زندگی کی تلخیوں، حقیقتوں سے بیگانہ اور دور کر دیا ہے۔ ابلیس اپنے اور اپنے مشیروں سے یہی کہتا ہے کہ صوفی و شاعر کو عالم کردار سے بیگانہ رکھو۔ کیونکہ اگر صوفی میں اصل دین جاگ گیا تو مسلمان قوم جاگ جائے گی۔ اگر شاعر حقیقتوں کا ترجمان بن گیا تو عام مسلمان بھی حقیقی زندگی اور حقیقت سے آشنا ہو جائیں گے۔

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

ذکر اور فکر یعنی تسبیح و مناجات و مراقبہ میں اسے مست الست رکھو۔ خانقاہی مزاج اتنا عام کرو کہ امت مسلمہ اس میں مست رہے۔ اقبال خانقاہی نظام کو مسلمانوں کو حرکت عمل، جدوجہد، تگ و دو اور سعی مسلسل سے علیحدہ کرنے کا سبب سمجھتے ہیں اس لیے اس بیماری جو مسلمانوں کو لاحق ہے کا بار بار ذکر کرنے اور بار بار علاج بھی تجویز کرتے ہیں۔ اس شعر میں ابلیس کی زبان سے مزاج خانقاہی میں تسبیح و مناجات اور مراقبوں میں مست رکھنے کا ذکر کرتے ہیں۔

مست رکھو میں ماضی بھی نکھر کر سامنے آتا ہے۔اور حال کی بے حالی بھی سامنے آتی ہے
اور مستقبل کی تباہی بھی نظر آتی ہے۔

ابلیس کی مجلس شوریٰ قریب 80 سال پہلے لکھی گئی۔ کیا آج ابلیس اور اس کے مشیر خوش
ہیں یا پریشان ہیں،ہم مسلمانوں سے یہ سوال ہے؟

زمین

عقل کو ملتی نہیں اپنے بتوں سے نجات!
عارف و عامی تمام بندۂ لات و منات!

اس شعر میں عقل عیار ہے سو بھیس بنالیتی ہے۔ وطن کے بت، جمہوریت کے بت اور سینکڑوں انداز کے بت مگر افسوس یہ ہے کہ عارف بھی عقل کی عیاری کا شکار ہو کر لات و منات کے پجاری بن چکے ہیں۔ عام آدمی کا ذکر ہی کیا اپنے آپ کو عارف سمجھنے والے بھی معرفت حقیقی سے دور ہو کر لات و منات کی بندگی میں جا پڑے ہیں۔ اقبال بدل بدل کر بار بار عارفوں، صوفیوں، زاہدوں، اہل مکتب، اہل مدرسہ کے فکری مغالطوں اور عملی کجیوں کا ذکر کرتے ہیں کیونکہ جب تک یہ رہبر و رہنما حقیقت شناس نہ ہوں گے عام مسلمان راہ حقیقی پر گامزن کیسے ہوں گے۔

maablib.org

آوازِ غیب

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سُلطانی و مُلّائی و پیری!

غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

'تو پھر ملوکیت ملائیت اور پیری کا مارا ہوا ہے تجھ میں وہ پہلی سی روشن ضمیری نہ رہی۔ مطلب یہ کہ ان تین اداروں یعنی ملوکیت نام نہاد و جاہل ملاؤں اور شعبدہ باز وفریب کار پیروں مرشدوں نے لوگوں کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر انھیں غلط راہ پر ڈالا اور یوں اسلام کو بے حد نقصان پہنچایا۔'

کوئی بھی ظالم و جابر حکمران اسی وقت تک اپنی حکومت قائم نہیں کر سکا جب تک اس نے ملاؤں اور صوفیوں کو اپنا ہمنوا نہیں بنایا۔ تاریخ میں عمومی طور پر تثلیث

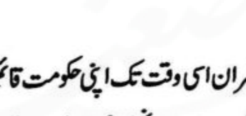

مل کر ہی حکمرانی کرتی نظر آتی ہے۔ مفادات کے لین دین اور دوسرے معاملات کو نظروں سے اوجھل رکھنے کے لیے NON ISSUES پر گرما گرمی دکھائی جاتی ہے، عیسائیت میں کلیسا اور روشن خیالی کی لمبی لڑائی ہے۔ آخر کار کلیسا کی ہار ہوئی۔

رباعیات

کہا اقبالؔ نے شیخِ حرم سے
تہِ محرابِ مسجد سو گیا کون؟
نِدا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بُت کدے میں کھو گیا کون؟

مہر لکھتے ہیں:

''اقبال نے ملا سے پوچھا مسجد کی محراب کے نیچے کون سو گیا ہے؟ جواب میں مسجد کی دیواروں سے یہ آواز سنائی دی کہ فرنگی بت کدے میں کون کھو گیا ہے علامہ نے اس دور کے علما اور ارباب منبر کی بے حسی، پہلے والے صحیح اسلامی جذبوں سے ان کے خالی ہونے کو مسجد کی محراب میں سونے سے تعبیر کیا ہے۔ جب کہ دوسری طرف ملت اسلامیہ مغربی علوم اور تہذیب و معاشرت میں جس طرح ڈوب چکی ہے اس پر بالواسطہ دکھ اور افسوس کا اظہار کیا ہے۔''

اقبال کے قریب سو سال بعد کیا محراب و منبر کے وارث اس کیفیت میں ہی ہیں یا اقبال کی خواہش پر تہہ محراب سونے سے جاگ چکے ہیں؟

maablib.org

مُلّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض

○

گر صاحبِ ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب!
دیں بندۂ مومن کے لیے موت ہے یا خواب!
اے وادیٔ لولاب!
مُلّا کی نظر نورِ فراست سے ہے خالی
بے سوز ہے میخانۂ صوفی کی مئے ناب!
اے وادیٔ لولاب!
بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب!

ملت کا زوال بھی منبر و محراب سے وابستہ ہے۔ جب محراب و منبر میں دین عربی صورت میں جلوہ فگن تھا تو مسلمانوں نے دنیا کو اسلامی تہذیب و تمدن سے روشناس کروایا۔ جب محراب و منبر پر افسردگی اور پژمردگی اور شکم پروری غالب آ گئی تو پھر مومنوں کا رہن بھی اور ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ محراب و منبر کی پژمردگی کی وجہ سے مسلمان بھی خواب میں پڑے ہیں اور یہ خواب ایک طرح کی موت ہی ہے، یہاں اقبال محراب و منبر کو مسلمان قوم کی روح و جوہر قرار دے کر اس کو دوبارہ فعال اور خوددار بنانا چاہتے ہیں۔ ملا زادہ ایک خود ساختہ کردار ہے جو کشمیر کی وادی لولاب کا رہنے والا ہے۔ ضیغم شیر کو کہتے ہیں۔

ملا کی نظر فراست سے خالی اور مے خانہ صوفی کی مئے ناب میں اب وہ گرمی اور سوز نہیں

رہا۔ یہاں بھی اقبال ملاّ اور صوفی کے بے عمل ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی کے میخانہ جانے والے اور معرفت کی شراب پینے والے حرکت و عمل سے عاری ہیں کیونکہ اس کے میخانہ کی شراب پینے سے جو فکر و نظر میں ذوق و سوز پیدا ہونا چاہیے وہ نہیں پیدا ہو رہا۔ ملاّ اور صوفی جو مسلمان امت کے جسم میں حرارت و سوز پیدا کرنے والے تھے۔ اب ان کے فکر سوچ سے اور حکمت نورِ فراست سے خالی ہو چکی ہے۔ یہاں اقبال نے فراست کے ساتھ نور لگا کر واضح کیا ہے کہ اصل اسلامی عربی روح سے یہ خالی ہیں۔

○

رندوں کو بھی معلوم ہیں صوفی کے کمالات
ہر چند کہ مشہور نہیں ان کے کرامات
خود گیری و خود داری و گلبانگِ "انا الحق"
آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات
محکوم ہو سالک تو یہی اس کا "ہمہ اوست"
خود مُردہ و خود مرقد و خود مرگِ مفاجات!

رند جو شرعی احکام سے واقف تو ہے مگر عمل پیرا نہیں۔ وہ صوفی کے کمالات سے واقف ہے بے شک کہ اس صوفی کی کرامات کے چرچے نہیں ہیں۔ یہاں اقبال عمل اور کرامات اور علم کا ذکر کرتے ہیں مگر عمل یعنی کردار ہی برتر ہے۔ باعمل اور بہتر کردار کے مالک کرامات کے مرہون منت نہیں ہوتے۔ اگلے شعر میں اقبال خود گیر یعنی اپنا احتساب آپ کرنے والا یہ کہ اپنا احتساب آپ کرنے سے خودداری پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر اللہ تک رسائی ہوتی ہے۔ سالک آزاد ہو تو یہ مقامات اس کی روحانی بلندی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور اگر سالک محکوم ہو، محکوم قوم کا فرد ہو یا محکوم خطے میں رہتا ہو تو یہ خود گیری و خودداری اور نعرہ انا الحق اس کے مقامات

کی بلندی کے برعکس اس کی خاک نشینی اور پستی کی دلالت بن جاتے ہیں۔

بڑالمبااور بڑاپیچیدہ مسلمانوں کی تاریخ میں یہ ہمہ اوست اور ہمہ اواوست کا معاملہ ہے۔ اقبال اس کی تباہی و بربادی سے پوری طرح آگاہ ہیں اور مسلمانوں کواس سے آگاہ بھی کرتے ہیں۔

حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

غالب کا یہ شعر مسلمانوں کی ہمہ اوست کی تاریخ اور فکر کا عکاس ہے۔اقبال غلاموں کے ہمہ اوست کا نتیجہ خودمردہ ہوجانا مر جانا زندگی چھن جانا۔فکرعمل چھن جانا۔صرف مناجات کرنا۔ مراقبے کرنا اور عمل سے عاری ہوجانا سمجھتے ہیں اسی کو اقبال خودمردہ اور خودمرقد کہہ کر مردہ جس قبر میں گیا ہے۔وہ اپنے ہی وجود میں دفن ہو چکا ہے۔جب حرکت سے،حرارت سے،شعلگی سے۔عمل سے عاری ہو گیا روح مردہ ہوگئی تو جسم ایک قبر بن گیا جس میں مسلمان دفن ہو گیا۔ اور یہ اچانک موت اس کی باربار ہوتی ہے۔ہر پل ہوتی ہے۔ہرروز ہوتی ہے۔

اقبال نے محکوم قوم ہمہ اوست کو مردہ ہو جانا۔قبر میں اتر جانا اور اچانک موت قرار دیا ہے۔

محکوم قوموں کی فکر اور سوچ کس کس انداز میں ظاہر ہوتی ہے اور ایک ہی عمل کس طرح مختلف نتائج پیدا کرتا ہے۔اقبال سے پوشیدہ نہیں۔

آزادقوم کا اناالحق اور انداز میں ظاہر ہوتا ہے

محکوم قوم کا اناالحق اور انداز کے اثرات ڈالتا ہے

صوفی کمالات کے چکر سے نکل کر اصل عربی دین کی طرف آئیں گے تو ہی مسلمان قوم بھی زندہ ہوگی!

○

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری

اگر امام حسین خانہ کعبہ میں بیٹھے اللہ اللہ کرتے رہتے۔ تسبیح ومناجات اور مراقبوں میں مستغرق ہو جاتے تو دین پر کیا گذرتی اگر حسین پیری مریدی اور خانقاہی نظام بنا کر نظام خلافت وحکومت سے الگ ہو جاتے تو دین کا کیا حال ہوتا۔

ظاہر ہے سامان حرب وضرب کی کمی۔ جوانوں کی کمی کے باوجود نکل پڑے اور کربلا کے میدان سے دین پر بیٹے بھانجے بھتیجے اور جاں نثار قربان کر دیے۔ اقبال بھی خانقاہوں میں بیٹھ کر اپنے پیری مریدی اور خانقاہی نظام کو مضبوط کرنے والوں سے کہتے ہیں کہ خانقاہوں کو چھوڑ کر حرکت اور عمل اور جدوجہد کی زندگی کی طرف آؤ ......اسوہ جو امام حسین اس پر عمل کرو۔ خانقاہوں میں تو فقط غم واندوہ ہے۔ زندگی معاملات اور حالات کے سامنے مردانہ وار ٹکرانے کا نام ہے ذکر وفکر اور تسبیح ومناجات جس کو خانقاہوں نے اپنالیا ہے یہ دل گیری واندہ ہے۔ اس میں زندگی نہیں ہے۔

اور جو دین کو تم نے یہ رنگ دے لیا ہے تو سنو یہ خانقاہی سلسلے جو ہیں یہ کلیسائی نظام کے انداز پر ہے اور اس خانقاہی نظام سے رہبانیت کی بو آتی ہے خانقاہوں میں بدن مسلمان ہے مگر روح کلیسائی ہے۔ اور پھر اقبال نے ایک بہت بڑی تاریخی حقیقت جس سے کوئی مورخ انکار نہیں کر سکتا بیان کر دی ہے۔ جب امتوں پر ضعیفی کا، ناتوانی کا، شکست وریخت کا عالم طاری ہوتا ہے تو وہ تصوف میں پناہ لیتی ہیں۔ یہ اُن کے مرنے ان کے تباہ ہونے ان کے زوال کی علامت ہے۔ تاریخ عالم واضح طور پر اقبال کی اس بات پر گواہ ہے۔ ہم چونکہ پاک ہند کے

باسی ہیں تو ہندومت کے ناتوانی اور ضعیفی کے وقت ان میں بھی تصوف در آیا تھا۔ اور ہندی تصوف ہندوستان کے مسلم تصوف میں بھی رنگ وروپ بدل کر شامل ہو گیا۔ اقبال اس بیماری سے امت کو بچانا چاہتے ہیں اور بار بار مسلمان کو جھنجھوڑتے ہیں!

○

تمام عارف و عامی خودی سے بیگانہ!
کوئی بتائے یہ مسجد ہے یا کہ میخانہ!
طلسم بے خبری' کافری و دینداری
حدیثِ شیخ و برہمن فسون و افسانہ
نصیبِ خطہ ہو یارب وہ بندۂ درویش
کہ جس کے فقر میں انداز ہوں کلیمانہ

اس بند میں بھی عارف و عامی کے خودی سے بیگانہ ہونے اور خودی سے بیگانہ ہونے کے بعد جو حالت ہوتی ہے اس کا نظارہ کروایا ہے۔ مسجد تو ایک خدا کے سامنے جھکنے کی جگہ ہے اس کے ایک ہونے قادر مطلق ہونے اور اس ایک کے سامنے جھکنے اور اقرار کرنے کی جگہ ہے مگر خودی سے بیگانہ ہونے کی بنا پر بت خانے کا نظارہ پیش کرتی ہے۔

میر واعظ کشمیر میں ایک مذہبی عہدہ ہے۔ مراد مذہبی رہنما ہے۔ اقبال کا یہ انداز ہے کہ وہ خاص چیز واقعہ یا شخص کو لے کر اس کے عمومی اثرات جو بہ حیثیت مجموعی مسلمانوں پر پڑتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ میر واعظ یعنی مذہبی رہنما نے بھی اصل دین کو ہم سے چھپایا ہے۔

تیسرے شعر میں اقبال نے شیخ و برہمن، فسون و افسانہ، لا کر ہندو اور مسلمان دونوں کا ذکر کر دیا ہے۔ جس طرح مسلمان کو شیخ نے چکر دیا ہوا ہے۔ اسی طرح کافر کو برہمن نے چکر دیا ہوا ہے۔ مسلمان بھی اور کافر بھی دونوں اس سے بے خبر ہیں کہ شیخ و برہمن نے اپنی شکم پروری کا

سامان کیا ہوا ہے۔

آخری شعر میں اقبال پھر مسلمان امت کی طرف آتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں اس خطہ یعنی ہندوستان میں کوئی ایسا مرد درویش پیدا ہو جس کے فقر میں عصائے کلیمانہ ہو۔اس سے پہلے اقبال حضرت سلمان فارسی اور حضرت عمر فاروقؓ کے فقر کا ذکر کر چکے ہیں۔عصائے کلیمی کے بغیر صرف تسبیح و مناجات اور مراقبوں سے وقت کے فرعونوں کو شکست نہیں دی جا سکتی۔

اقبال کے ضرب کلیمی اور شمشیر شاہباز، شاہین اور دیگر استعاروں کے سبب امن پسند اور مہذب سکالرز نے اقبال کو پتہ نہیں کیا کیا نام دیئے ہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ علم اور عمل اور طاقت مل کر دنیا پر غالب آتے ہیں۔صرف وعظ و نصیحت سے نہیں! اقبال اس حقیقت کا ذکر کرتے ہیں اور بار بار کرتے ہیں کہ عصا کے بغیر کلیمی بے کار ہے۔

O

حریف اپنا سمجھ رہے ہیں مجھے خدایانِ خانقاہی
انہیں یہ ڈر ہے کہ میرے نالوں سے شق نہ ہو سنگِ آستانہ
غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمز آشکارا
زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے' فضائے گردوں ہے بے کرانہ

اقبال فرماتے ہیں کہ خانقاہوں کے گدی نشین یہ پیر مجھے اپنا حریف سمجھ رہے ہیں انھیں یہ خوف لاحق ہے کہ اقبال کے نالہ ہائے بلند سے کہیں آستانہ عالیہ کا پتھر شق نہ ہو جائے۔جس انداز میں جس لے میں جس سوز سے۔جس علم سے جس عرفان سے اقبال نے ہزار رنگ میں ان آستانوں کی قلعی اتاری ہے تو ان آستانوں کے خانقاہوں کے پیروں اور گدی نشینوں نے اقبال کو اپنا حریف سمجھنا ہی تھا۔آج سو سال بعد بھی اقبال کے نالے بلند ہو رہے ہیں۔

دوسرے شعر میں غلامی کے نفسیاتی اثرات کا ذکر ہے۔ غلام قوموں کے علم وعرفان کے یہی کمالات ہوتے ہیں کہ دنیا میں اگر محکوم ہو جائیں۔ ذلیل وخوار ہو جائیں کم حقیقت اور بے حقیقت ہو جائیں تو دنیا سے الگ ہو کر فضائے بسیط میں بسیرا کر لیں۔ ہواؤں میں اڑنے کی کرامات کا ذکر کرنے لگیں۔ قصے کہانیاں سنا کر مریدوں کی تعداد بڑھا لیں۔ کیونکہ فضائے نیل گوں کا تو کوئی کنارہ نہیں جس طرح کے مرضی فرضی قصے سنا سنا کر اپنے مریدوں کو دنیا کی تگ و دو سے الگ کر دیں۔ بے عمل کر دیں۔ غلام قوموں کے مزاج کس طرح ہو جاتے ہیں اور زمانے میں ناقدری اور کم حیثیتی کی تلافی کس طرح فرضی کہانیوں میں پناہ لے کر کرتے ہیں۔ اقبال کے نالہ ہائے بلند آج بھی بلند ہو رہے ہیں کہ آج بھی اقبال کی فکر ونظر کی ضرورت اقبال کے دور سے زیادہ ضروری ہے!

---

maablib.org

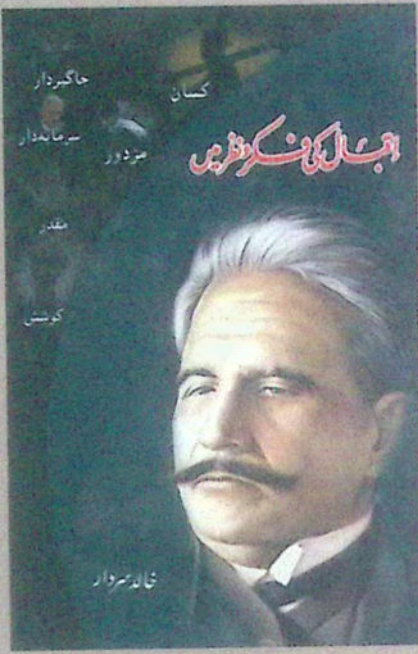

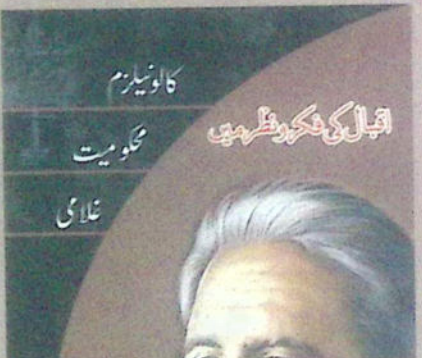

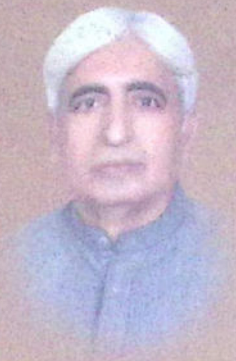

نگارشات پبلشرز
24 مزنگ روڈ، لاہور، پاکستان
Ph: +92-42-37322892 Fax: 37354205
E-mail: nigarshat@yahoo.com nigarshatpublishers